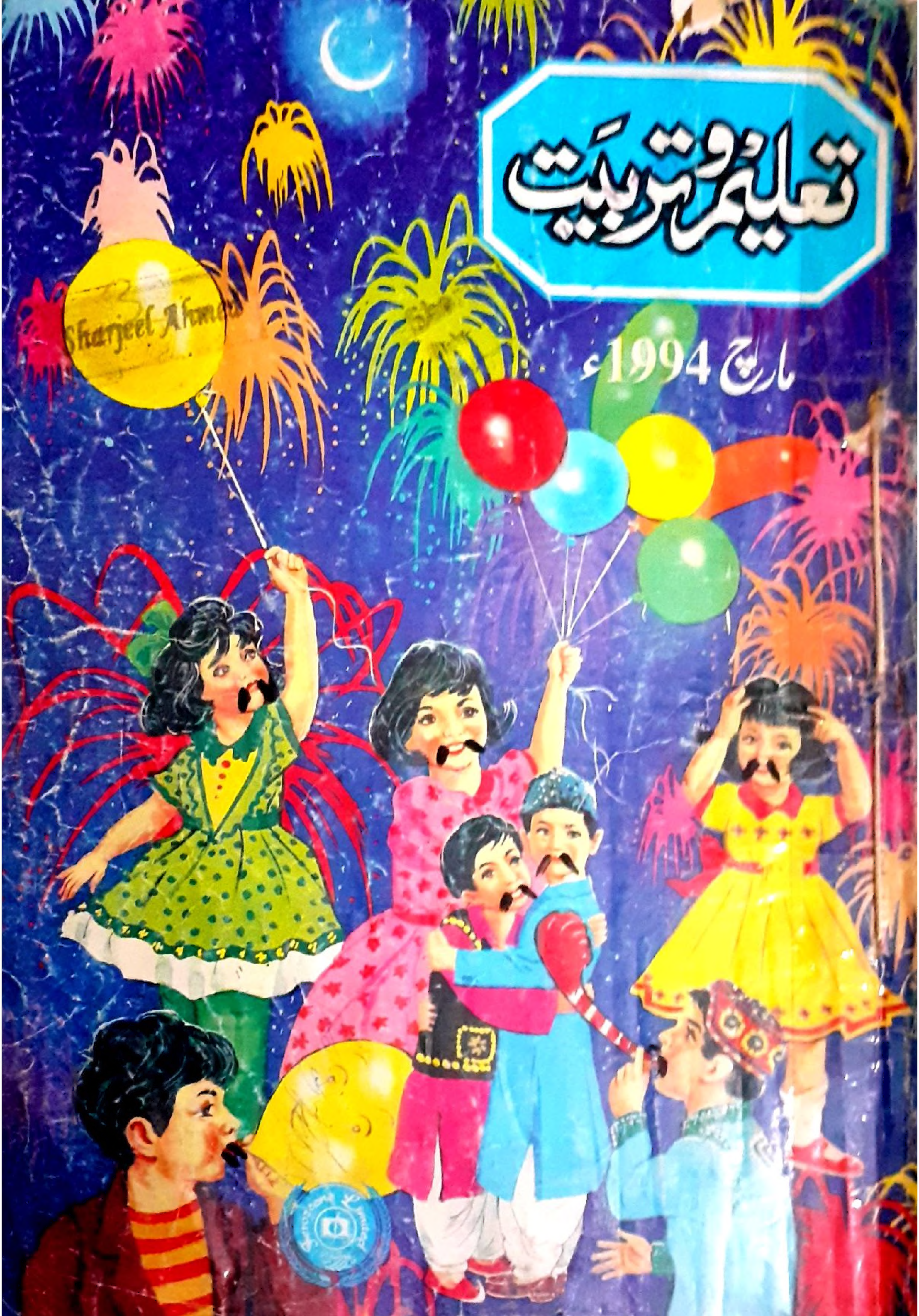
تعلیم و تربیت
مارچ 1994ء

53 واں سال
بارہواں شمارہ

تعلیم و تربیت

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا
بچوں کا محبوب رسالہ

...ٹ ایڈیٹر	عبدالسلام
...یٹر	سعید لخت
...ٹسٹ ڈیزائننگ	سید شوکت اعجاز
...یشن اسسٹنٹ	محمد بشیر راہی

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور
...شر: ظہیر سلام
...ر: عبدالسلام

پتا
ماہنامہ تعلیم و تربیت
32-، شارع بن بادیس لاہور
فون:- 6361309-6361310
6278815-6278816

سرکولیشن اور اکاؤنٹس
60- شاہراہِ قائداعظم لاہور

سالانہ قیمت

...ان میں (صرف رجسٹری کے ساتھ) -/225 روپے
...رقِ وسطیٰ/افریقہ (ہوائی ڈاک سے) -/435 روپے
...پ (ہوائی ڈاک سے) -/625 روپے
...مریکہ/مشرقِ بعید (ہوائی ڈاک سے) -/650 روپے

مارچ 1994

قیمت فی پرچہ -/10 روپے

سرورق: آئی عید

عیدِ مُبارک

اللہ

السَّلامُ علیکمُ

اِس مہینے آپ کو اِکٹھی دو خوشیاں مِلیں گی۔ ایک عیدُالفطر کی، دُوسری یومِ پاکستان کی۔ ہماری طرف سے آپ کو یہ خوشیاں بہت بہت مُبارک ہوں۔

مارچ کی 13 تاریخ کو عیدُالفطر ہے۔ مسلمان یہ عید رمضان کے روزے پُورے ہونے کی خوشی میں مناتے ہیں۔ عید کے روز صبح سویرے اُٹھ کر غسل کریں، صاف سُتھرے کپڑے پہنیں اور پھر عید گاہ یا کسی بڑی مسجد میں نماز پڑھنے جائیں۔ نماز سے پہلے کھجوریں، سِویّاں یا کوئی میٹھی چیز کھانا اچّھا ہے۔

عید کے دِن مُسلمان خدا کی راہ میں صدقۂ فِطر دیتے ہیں۔ یہ صدقہ ہر اُس مسلمان پر لازِم ہے جس کے پاس ساڑھے باون تولے چاندی یا ساڑھے سات تولے سونا ہو۔ ایسے شخص کو چاہیے کہ وہ گھر کے ہر فرد کی طرف سے دو سیر گیہوں یا اُن کی قیمت کسی غریب کو دے دے۔ صدقۂ فِطر نماز سے پہلے دینا اچّھا ہے، لیکن نماز کے بعد بھی دیا جا سکتا ہے۔

جب نماز کے لیے گھر سے نکلیں تو راستے میں تکبیر پڑھتے جائیں، اور عید گاہ یا مسجد میں جہاں جگہ ملے، بیٹھ جائیں۔ نماز سے پہلے اِمام صاحِب عید کی نماز کی نیّت اور نماز پڑھنے کا طریقہ بتاتے ہیں۔ اُسے غور سے سُنیے۔ نماز کے بعد اِمام صاحب دو خُطبے پڑھیں گے۔ اُن کا سُننا اِتنا ہی ضروری ہے جتنا نماز پڑھنا۔ اُنھیں نہایت اِطمینان اور سکون سے سُنیے۔ خُطبے کے بعد دوست احباب سے گلے ملیے اور اُنہیں عید کی مُبارک باد دیجیے۔ اِس کے بعد اُس راستے سے گھر واپس نہ آیئے، جِس راستے سے آپ گئے تھے۔ کوئی دُوسرا راستہ اختیار کیجیے۔ ایسا کرنا سُنّت ہے۔

اس شمارے میں

اداریہ		1
آئی عید (نظم)	حفیظ الرحمن احسن	2
کیسی چاہت کیسا اپنا پن (کہانی)	ثاقبہ رحیم الدین	3
بلا عنوان کارٹون		6
صبح کا بھولا (کہانی)	محمد افتخار کھوکھر	7
ذہنی معذور بچوں کی دیکھ بھال	ڈاکٹر عبدالرؤف	11
محسن نے عید منائی	ڈاکٹر نصیر احمد ناصر	12
میری زندگی کا انوکھا واقعہ (کہانی)	سلیم خان گمی	14
اسپیشل بچے (کہانی)	محمد فاروق انجم	19
بدگلی (کہانی)	سلیم احمد صدیقی	23
یومِ پاکستان (نظم)	فرحت شاہجہان پوری	27
یورپ	ک۔ س	28
دروازہ (کہانی)	سیدہ صاعقہ بانو	31
سائنس کے کھیل		34
آیئے مسکرائیں		35
آپ جانتے ہیں؟		36
ہیرا اور پتھر (کہانی)	سید اشتیاق الحسن	37
قول اور فعل (کہانی)	رضوان محمد خاں ثاقب	40
آیئے، دوست بنائیں		44
علمی آزمائش		45
آپ کا خط ملا		47
چٹ پٹے مسالے دار		50
آپ بھی لکھیے		52
آگئی ہے بہار (نظم)	امان اللہ نیر شوکت	57
نیلے انسان کا انجام (ناول)	محمد یونس حسرت	58
حضرت عثمانؓ	مبین الحق فرید کوٹی	64

خوشیاں لے کر آئی عید کتنی خوشیاں لائی عید

○

رنگ برنگے کپڑے ہیں ہم نے آج ہی پہنے ہیں
کتنے اچھے لگتے ہیں کتنے پیارے لگتے ہیں
خوشیاں لے کر آئی عید کتنی خوشیاں لائی عید

عید پڑھیں گے آج ضرور مسجد[1] ہے گو ہم سے دُور
جائیں گے ابّو کے ساتھ ڈال کے اُن کے ہاتھ میں ہاتھ

○

مِل جُل کر ہم گھومیں گے جی بھر کے ہم کھیلیں گے
سب سے ملنے جائیں گے خوشیاں خوب منائیں گے
خوشیاں لے کر آئی عید کتنی خوشیاں لائی عید

حفیظ الرحمٰن احسن

[1] مُراد ہے عید گاہ

صُبح کا بھُولا

محمد اِفتخار کھوکھر

شیخ عبدُالوہاب اپنے بنگلے کے لان میں، بیوی بچّوں کے ساتھ، شام کی چائے پی رہا تھا کہ کسی نے گیٹ پر لگے ہوئے گھنٹی کے بٹن کو دبایا، جس سے ایسا لگا کہ کئی پرندے ایک ساتھ چہچہا اُٹھے ہوں۔ گھنٹی کی آواز سُن کر ملازِم گیٹ کی جانب لپکا۔

"آپ کو کس سے ملنا ہے؟" مُلازِم نے گیٹ پر کھڑے بڑی عُمر کے آدمی اور دو لڑکوں سے پُوچھا۔

"ہمیں سیٹھ وہاب سے ملنا ہے" بڑی عُمر کے آدمی نے مُختصر سا جواب دیا۔ یہ سُن کر ملازِم اُلٹے قدموں سیٹھ عبدُالوہاب کے پاس آیا۔

"دو لڑکے اور ایک بڑی عُمر کا آدمی آپ سے ملنا چاہتے ہیں" اُس نے بتایا۔

"یہ بھلا مُلاقات کا وقت ہے؟ لوگ خواہ مخواہ تنگ کرتے رہتے ہیں" عبدُالوہاب نے ناگواری کا اِظہار کرتے ہوئے کہا "جاؤ، انہیں یہیں لان میں لے آؤ"۔

"السّلامُ علیکُم" تین آوازیں ایک ساتھ گُونجیں۔ سیٹھ عبدُالوہاب نے چونک کر دیکھا تو سامنے شہر کے جانے پہچانے سماجی کارکُن حاجی فضل نواز اور دو لڑکے کھڑے تھے۔

"آیئے، تشریف رکھیے" عبدالوہاب نے اپنے ناگوار جذبات کو دباتے ہوئے کہا۔

"سیٹھ صاحِب، آپ کو معلوم ہی ہے کہ وادیِ کشمیر میں اِن دِنوں بھارتی فوجیوں نے ظلم کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ بے شمار بچّے اُن کے ہاتھوں اپاہج اور معذور ہو چکے ہیں۔ ہم نے اِن معذُور بچّوں کے عِلاج اور تعلیم و تربیت کے لیئے "دارُ الکفالت" قائم کیا ہے"۔ حاجی فضل نواز نے اپنی آمد کا مقصد بتاتے ہوئے کہا۔

"آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔ میرے پاس وطن کے دُشمنوں اور اُن کے بچّوں کی مدد کے لیے کوئی پیسہ نہیں۔ اُنھوں نے کشمیر جیسی پُراَمن اور جنّت نظیر وادی کو میدانِ جنگ میں تبدیل کر دیا ہے"۔ سیٹھ عبدُالوہاب نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

شیخ عبدُالوہاب اپنے وسیع کاروبار کی وجہ سے سیٹھ وہاب کے نام سے مشہُور تھا اور مقبُوضہ کشمیر کے دارُالحکُومت سِری نگر اور اُس کے آس پاس اُس کے بے شُمار باغ تھے، جہاں سے اعلیٰ قِسم کا سیب بھارت کے عِلاوہ غیر مُلکوں کو بھی سپلائی کیا جاتا تھا۔ جب سے کشمیری نوجوانوں نے آزادی کی جنگ شروع کی تھی، سیٹھ کی پھلوں کی تجارت کو سخت نُقصان پہنچا تھا۔ اِس لیے اُسے اِن حُریّت

پسندوں سے شدید نفرت تھی۔ اُس نے اپنے تمام مُلازموں کو سختی سے تاکید کر دی کہ میں یہاں موجود ہوں یا باہر دورے پر گیا ہُوا ہوں، آیندہ اِس قسم کے لوگوں کو میرے بنگلے میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ یہ لوگ نہ صرف کشمیر کے امن و سکون کو تباہ کر رہے ہیں، بلکہ پوری دنیا میں بھارت کی ناک کٹوا رہے ہیں۔ میں کاروبار کے سِلسلے میں جس مُلک میں بھی جاتا ہوں، وہاں سب سے پہلے مجھ سے یہی سوال کیا جاتا ہے کہ کشمیر میں ہنگامے کیوں ہو رہے ہیں، اور وہاں نہتّے کشمیریوں پر ظلم و سِتم کیوں کیا جا رہا ہے؟ یہ سب انہی چند شرپسندوں کا کیا دھرا ہے۔

وادیِ کشمیر میں بھارت کے خلاف کشمیری نوجوانوں کی جدّوجہد میں اِضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ پولیس کی ناکامی کے بعد بھارتی فوج کے کئی ڈویژن بھی جدّوجہدِ آزادی کو کُچلنے میں کام یاب نہیں ہو رہے تھے۔ اِس صورت حال میں پہاڑی عِلاقوں میں چھاپا مار کارروائیوں کے ماہر کمانڈو کی خدمات حاصل کی گئی تھیں، اور اُنہیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ سِری نگر شہر کے ایک ایک گھر کی سختی سے تلاشی لیں، کیوں کہ بعض لوگ حُریّت پسندوں کو اپنے ہاں پناہ دیتے ہیں۔

جُمعے کا دن تھا۔ لوگ نماز کی تیاّریوں میں مصرُوف تھے کہ بھارتی کمانڈو نے اچانک اُس علاقے کو گھیر لیا جہاں سیٹھ وہاب کا بنگلا تھا۔ اُنھوں نے تمام گھروں کے بچّوں، نوجوانوں اور بوڑھوں کو میدان میں جمع کرنا شروع کر دیا۔ جب وہ سیٹھ وہاب کے بنگلے میں داخل ہونے لگے تو چوکیدار نے کہا کہ سیٹھ صاحِب باہر دورے پر گئے ہوئے ہیں، اِس لیے آپ اندر داخل نہیں ہو سکتے۔ یہ سُنتے ہی ایک کمانڈو نے چوکیدار کو گردن سے پکڑ کر ایک جانب اُچھال دیا اور وہ سب بنگلے میں داخِل ہو گئے۔

بنگلے کے لوگ گیٹ پر ہونے والے شور شرابے کی وجہ سے پہلے ہی ایک جگہ جمع ہو چکے تھے۔ ایک کمانڈو نے آگے بڑھ کر حکم دیا کہ تمام مرد باہر نکل آئیں۔ یہ سُن کر سیٹھ وہاب کے بیٹے جاوید، زاہد، خالِد اور دو مُلازِم خوف سے کپ کپاتے ہُوئے باہر نکل آئے۔

سیٹھ وہاب کے بڑے بیٹے جاوید نے خوشامدانہ لہجے میں کہا "ہم تو بھارتی حکومت کے وفادار ہیں۔ ہمارا تخریب کاروں سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے ابّو......."

"بک بک بند کرو اور سیدھی طرح ہمارے ساتھ چلو" یہ آواز کمانڈو اِنچارج کی تھی۔

کمانڈو اُن سب کو گھسیٹتے ہوئے بنگلے سے باہر لے آئے، جہاں کچھ فاصلے پر، کُھلے میدان میں اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔ کمانڈو کے اِنچارج نے سخت لہجے میں اُن سے پوچھا کہ اُن کے ہاں کشمیری تخریب کار پناہ لیتے ہیں یا نہیں، لیکن سب ہی نے اِنکار کیا۔ یہ سُن کر اِنچارج غصّے سے آگ بگولا ہوگیا اور اُس نے حکم دیا کہ اِن لوگوں کی خوب خاطِر کرو۔

سیٹھ وہاب کے بیٹوں کی باری آئی تو وہ اپنی بے گُناہی اور بھارتی حکومت سے وفاداری کا یقین دلاتے رہے، لیکن کمانڈو نے اُن کی ایک نہ سُنی۔ سیٹھ کے دو بیٹوں جاوید اور زاہد نے تو کمانڈو کے جُوتوں کی ضربیں سہ لیں، لیکن چھوٹا بیٹا خالد ایک ہی ضرب پر چیخ اُٹھا اور ڈر کے مارے بھاگ کھڑا ہُوا۔ اِس پر ایک کمانڈو نے اُس کی ٹانگ کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ خالد زمین پر گر پڑا۔ جب وہ درد سے تڑپ تڑپ کر بے ہوش ہوگیا تو کمانڈو کے اِنچارج کے دِل میں جانے رحم کی چنگاری کیسے بھڑکی کہ اُس نے خالد کے بھائیوں سے کہا کہ وہ اُسے اُٹھا کر لے جا سکتے ہیں۔

جاوید اور زاہد خالد کو اُٹھا کر گھر کی جانب لپکے۔ وہاں سے اُنھوں نے گاڑی لی اور اُسے ہسپتال لے گئے۔ اُسے فوری طور پر اِنتہائی نگہ داشت کے وارڈ میں لے جایا گیا۔ مُسلسل دو گھنٹے کے چیک اَپ کے بعد ڈاکٹر اِس نتیجے پر پہنچے کہ گولی کا اثر پُورے جِسم میں پھیلنے کا خطرہ ہے، اِس لیے اِس کی جان بچانے کے لیے ضروری ہے کہ ٹانگ گھُٹنے کے قریب سے کاٹ دی جائے۔

خالد کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ اِس لیے سیٹھ

sharper

وہاب کے گھر والوں نے مجبوراً ڈاکٹروں کو خالد کی ٹانگ کاٹنے کی اِجازت دے دی۔ اُنہوں نے آپریشن کے ذریعے ٹانگ کاٹ دی اور پلاسٹر چڑھا دیا۔ بیس دن ہسپتال میں رہنے کے بعد ڈاکٹروں نے اُسے گھر جانے کی اِجازت دے دی اور وہ گھر آگیا۔

سیٹھ عبدُالوہاب ڈیڑھ ماہ بعد واپس سِری نگر پہنچا تو تحفوں سے لدا پھندا تھا۔ خالد گھر میں سب سے چھوٹا تھا، اِس لیے تحفے بھی سب سے زیادہ اُسی کے لیے تھے۔ سیٹھ نے کوٹھی میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے خالد کو آواز دی "خالد بیٹا! اِدھر آؤ۔ دیکھو تو۔۔۔۔۔۔۔ میں تمہارے لیے کیا کچھ لایا ہُوں"۔ لیکن اِس مرتبہ خالد اُس کی آواز سُن کر بے تابی سے بھاگ کر آتا ہُوا دکھائی نہ دیا تو اُس نے مُلازِم سے پوچھا "خالد کہاں ہے؟"

"صاحِب جی" مُلازِم نے ڈرتے ڈرتے کہا "چھوٹے صاحِب گھر پر نہیں ہیں۔ وہ۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔"۔

"کیا وہ وہ کی رٹ لگا رکھی ہے؟ سیدھی طرح بتاؤ کیا بات ہے"؟ سیٹھ نے غصّے سے کہا۔

اِتنے میں شور کی آواز سُن کر سیٹھ کے سارے گھر والے باہر نکل آئے۔ لیکن اُن میں خالد نظر نہ آیا۔ سیٹھ نے ابھی "خالد۔۔۔۔" ہی کہا تھا کہ اُس کی بیوی روتی ہُوئی آگے بڑھی اور ہچکیاں لے لے کر اُسے بھارتی فوجیوں کے ظُلم کی ساری داستان سُنادی۔ سیٹھ وہاب غصّے سے لال پیلا ہوگیا۔ اُس نے کہا "خالد سے تو بعد میں مِلوں گا، اِس سے پہلے فوج کے افسروں سے نمٹ لُوں۔ اُن کو یہ کیسے جُرأت ہوئی کہ میرے بنگلے میں بغیر اِجازت داخل ہوئے اور میرے جگر گوشے کو زندگی بھر کے لیے معذُور کر دیا؟"

سیٹھ وہاب نے اعلیٰ حُکاّم کو فون کیا تو اُن کی جانب سے اِتنا رُوکھا پھیکا جواب ملا کہ سیٹھ اُس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے حکومت کے لیے اپنی خدمات گِنوائیں، لیکن دوسری جانب سے مُسلسل بے رُخی کا مُظاہرہ ہُوا تو غصّے سے اُس کے ہاتھ سے ریسیور گر پڑا اور وہ بے سُدھ ہو کر مسہری پر گر گیا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ بھارتی اُس کی خِدمات کا یہ صِلہ دیں گے۔

تین ماہ عِلاج مُعالجے کے بعد خالد چلنے پھرنے کے قابل ہوگیا۔ لیکن بیساکھی اُس کی زندگی کا مُستقِل روگ بن گئی تھی۔ بیٹے کو بیساکھی کے سہارے چلتا دیکھ کر سیٹھ وہاب کو دُنیا بھر کی نِعمتوں اور آرام و آسائش کی زندگی بے رنگ سی محسُوس ہونے لگی۔

ایک دن سیٹھ افسُردگی کے عالَم میں اخبار کی وَرَق گردانی کر رہا تھا کہ اُس کی نظر ایک چھوٹے سے اِشتہار پر ٹِک گئی۔ اِشتہار میں اُن معذور بچّوں کے لیے امیروں سے مدد کی اپیل کی گئی تھی، جو بھارتی فوجیوں کے وحشیانہ مظالِم کے نتیجے میں ہاتھ پاؤں سے محرُوم ہو کر معذُوری کی زندگی

گزار رہے تھے۔

سیٹھ وہاب نے ملازم کو اشتہار میں دیے گئے نمبر پر فون کرنے کے لیے کہا۔ رابطہ ہُوا تو دوسری جانب سے حاجی فضل نواز کی آواز سُنائی دی جو کافی عرصہ پہلے سیٹھ وہاب کے بنگلے میں دو لڑکوں کے ساتھ آئے تھے۔ ملازم نے اُن سے کہا کہ سیٹھ صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ جواب میں حاجی فضل نواز نے کہا "کیا ہماری بے عزّتی میں کوئی کسر باقی رہ گئی تھی کہ سیٹھ صاحب کو پھر ہماری یاد آئی ہے؟"

"ایسی بات نہیں۔ سیٹھ صاحب بہت شرمندہ ہیں۔ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آپ آج ہی تشریف لے آئیں تو وہ آپ کے شکرگزار ہوں گے" ملازم نے کہا۔

حاجی فضل نواز کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ کیا واقعی یہ سیٹھ وہاب کے ملازم کا فون تھا؟ کہیں کسی نے اُن سے مذاق تو نہیں کیا۔ تصدیق کے لیے انہوں نے خود سیٹھ وہاب کا فون نمبر ڈائل کیا تو دوسری جانب سے اُسی ملازم نے ریسیور اُٹھایا۔ اب اُنہیں یقین ہوگیا کہ اُن کے ساتھ کسی نے مذاق نہیں کیا۔ وہ فوراً ہی سیٹھ کے بنگلے پر پہنچ گئے۔ گیٹ پر خود سیٹھ اُن کا مُنتظر تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر حاجی صاحب کا اِستقبال کیا اور پھر اُنہیں ڈرائینگ رُوم میں لے گیا۔

حاجی فضل نواز صوفے پر بیٹھے ہی تھے کہ بیساکھی کے سہارے چلتا ہُوا ایک پیارا سا لڑکا ڈرائنگ رُوم میں داخل ہوا۔ یہ سیٹھ وہاب کا چہیتا بیٹا خالد تھا۔ حاجی صاحب نے سیٹھ سے پُوچھا "اِسے کیا ہُوا؟ میں پہلے یہاں آیا تھا تو یہ بھلا چنگا تھا"۔

"اِسی لیے تو میں نے آپ کو بُلوایا ہے کہ بتا سکوں کہ یہ کیا ہُوا اور کیسے ہُوا؟" سیٹھ وہاب نے کہا۔ پھر اُس نے حاجی صاحب کو بتایا کہ کس طرح اُس نے اپنے ہم وطن کشمیریوں سے بے وفائی کی اور بھارتی حکومت کا ساتھ دیا، اور کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ ثابت کرنے کے لیے بھارتیوں سے زیادہ بھارت کا وفادار بننے کی کوشش کی۔ لیکن اِس کا صِلہ اُس کو یہ مِلا کہ اُس کی غیر حاضری میں اُس کے گھر والوں کو بے عزّت کیا گیا اور خالد کو زندگی بھر کے لیے معذُور کر دیا گیا۔

"مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے مجھے اپنے کیے کی سزا ملی ہے۔ اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آج سے میری تمام دولت معذُور اور بے سہارا کشمیری بچّوں کے لیے وقف ہوگی۔ جب خود میرے بیٹے کو معذُوری کا روگ لگا تو مجھے دوسروں کے درد کا اِحساس ہُوا"۔

"سیٹھ صاحِب، صُبح کا بُھولا شام کو گھر واپس آجائے تو اُسے بُھولا نہیں کہتے" حاجی فضل نواز نے سیٹھ وہاب کو گلے لگاتے ہُوئے کہا۔

Sharjeel Ahmed

درسِ قرآن

ذہنی معذور بچّوں کی دیکھ بھال

اِس شمارے میں ہمارا موضوع ہے: ذہنی معذور بچّوں کی دیکھ بھال- قرآنِ حکیم کی جس آیت کا ہم نے اِنتخاب کیا ہے، وہ یہ ہے:

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاۗءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْھُمْ فِيْهَا

وَاكْسُوْھُمْ وَقُوْلُوْا لَھُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۝

اِس آیتِ مُبارَکہ کا لفظی ترجمہ یوں ہے: اور تم اپنی وہ دولت جسے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے سرمایۂ زندگی بنایا ہے، نادانوں (ذہنی معذوروں) کے حوالے نہ کرو- البتّہ انھیں کھانے پینے کے لیے دو اور اُن کی رہنُمائی کرتے رہو-

یہ قرآنِ مجید کے چوتھے پارے کی چوتھی سُورت (اَلنِّساء) کی پانچویں آیت کی مکمّل عبارت ہے- اِس قرآنی حکم کا اصل مقصد یہ ہے کہ ذہنی طور پر معذوروں کو بغیر سوچے سمجھے مال و دولت دے دینا مناسب نہیں کیونکہ اُن میں کھوٹے کھرے کی تمیز نہیں ہوتی- اِس کی بجائے یہی بہتر ہے کہ اُن کے کھانے پینے، لباس و پوشاک، کھیل، تفریح اور ہدایت و رہنُمائی پر مناسب توجّہ دی جائے-

کم عقل، نادان اور ذہنی معذور بچّوں کی سُوجھ بُوجھ اور عقل و دانش عام انسانوں سے بہت کم ہوتی ہے- چناں چہ عام بچّوں کی طرح اُن کی تعلیم و تربیت ممکن نہیں- اِسی لیے قرآنِ حکیم نے یہ حکم دیا ہے کہ اُن کی دیکھ بھال کا سلسلہ خوراک، لباس، سیر، تفریح اور چھوٹی موٹی رہنُمائی تک ہی محدود رکھا جائے-

قابلِ غور بات یہ ہے کہ دنیا میں ذہنی معذوروں کی دیکھ بھال کی تحریک شروع ہوئے ابھی چند سال ہی ہوئے ہیں- مگر اِسلام نے اُن کی زندگی سنوارنے کے صحیح اور ممکن اِقدام صدیوں پہلے ہی بتا دیے تھے-

ڈاکٹر عبد الرؤف

Sharjeel Ahmed

مُحسن نے عید منائی

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

سنہری چڑیا بولی

آج میں آپ کو ایک نہایت سبق آموز کہانی سُناتی ہوں۔ یہ ایک نیک دل لڑکے کی داستان ہے۔ اُس کا نام تھا مُحسن۔ آپ جانتے ہیں کہ مُحسن کے معنی ہیں، دُوسروں کے ساتھ اِحسان کرنے والا اور اُن کے کام آنے والا، نیز اُن کے لیے اِیثار و قُربانی کرنے والا۔ مُحسن یہ اچّھی صِفات رکھتا تھا۔ اُس کا ایک دوست تھا جس کا نام تھا شکور۔ اِس کے معنی ہیں شکر کرنے والا۔ وہ غریب والِدین کا چشم و چَراغ تھا، جب کہ مُحسن ایک امیر گھرانے سے تعلّق رکھتا تھا۔ لیکن دونوں میں سچّی دوستی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ سچّا دوست بہُت بڑی نعمت ہوتا ہے، جس کی قدر کرنا چاہیے۔ مُحسن اور شکور دونوں ہم جماعت تھے اور ایک ہی اِسکول میں پڑھتے تھے۔ اِکٹھے اِسکول جاتے اور آتے تھے۔ محسن اسکول میں جو خود کھاتا پیتا، وہی شکور کو بھی کھلاتا پلاتا۔ یہ اُس کی عادت تھی۔

رَمضانُ المُبارک آیا تو دونوں نے روزے رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اِفطار کے وقت محسن اپنی ماں سے پُوچھ کر شکور کے گھر کھانے پینے کی چیزیں بھیجتا۔ اُس کی اِس اچھّی عادت سے مُحسن کے ماں باپ بہُت خوش تھے اور اپنے صالح بیٹے سے بہت پیار کرتے تھے۔

رمضانُ المُبارک کے روزوں کے بعد عید آتی ہے اور چوُں کہ ہر سال بار بار آتی ہے، اِس لیے اِسے عید کہتے ہیں۔ یہ تو اِس کے لُغوی معنی ہیں۔ عید خوشی کے دن کو کہتے ہیں۔ خوشی اِس بات کی کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مُطابق مسلمان ایک ماہ روزے رکھتے ہیں، اور اُن کی تاثیر سے وہ متّقی (مُت تقی) یعنی پرہیزگار بندے بنتے ہیں۔ متّقی بندوں کے دِلوں میں ہدایت پانے کی آرزُو اور گُم راہی سے بچنے کا ڈر ہوتا ہے۔ چُناں چہ ایسے مسلمانوں ہی کو قرآنِ مجید ہدایت دیتا ہے، یعنی اُن کو جنّت اور کام یابی کی سیدھی راہ دکھاتا ہے۔ متّقی لوگوں سے اللہ تعالیٰ پیار کرتا، اُن کو اِنعام و اِکرام سے نوازتا اور اپنے بندے اور دوست بنالیتا ہے۔ اِن کو ہی اولیاء اللہ یعنی اللہ کے دوست کہتے ہیں۔ کیا یہ خوشی کی بات نہیں؟ یقیناً ہے۔

چُناں چہ جب مسلمان روزے رکھ کر متّقی بنتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے عید مناتے ہیں۔ اِس روز نہا دھو کر نئے یا صاف سُتھرے کپڑے پہنتے ہیں۔ چوُں کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ کو خوش بو بہُت پسند تھی، اِس لیے آپؐ کی پیروِی میں مسلمان بھی عید کے روز خصُوصیّت سے خوش بو لگاتے ہیں۔ غریب غُربا کو عید منانے کے لِیے شرعی طریقے سے پیسے دیتے ہیں، جسے فِطرانہ کہتے ہیں۔ پھر مِل کر کسی کُھلی جگہ عید کی نماز ادا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے حضُور اُس کا شکر کرتے ہیں کہ اُس نے اُنھیں روزے رکھنے اور متّقی بننے کی توفیق بخشی۔ نماز سے فارغ ہو کر دوست احباب ایک دوسرے سے گلے ملتے اور مُبارک باد دیتے ہیں۔

عید کے روز حسبِ توفیق مسلمان اچھّے اچھّے پکوان پکاتے اور دوستوں، عزیزوں اور ہم سایوں کو بھیجتے ہیں، اور بچّوں کو عیدی دیتے ہیں۔ بچّوں کو عیدی ملتی ہے تو وہ بہُت خوش ہوتے ہیں۔ عید دراصل روزے رکھ کر متّقی بننے والوں کی ہوتی ہے یا پھر معصوم بچّوں کی۔

مُحسن کے والِدین بہُت خوش تھے کہ اُن کا بیٹا روزے رکھنے کے قابل ہُوا۔ اُنھوں نے اُس کے لیے عُمدہ کپڑے سِلوائے، قیمتی جوُتے خریدے، خوب صُورت ٹوپی خریدی، عطر کی ایک چھوٹی سی شیشی بھی لے کر دی۔ محسن یہ سب چیزیں دیکھ کر خوش تو بہت ہوا، لیکن ساتھ ہی اُسے اپنے عزیز دوست شکور کا خیال آیا کہ اُس کے والِدین اُسے یہ

Sharyu

چیزیں خرید کر نہیں دے سکتے۔ اُس کے ننھے دل میں درد کا کانٹا چُبھ گیا، اور اُس کی خلش نے اُسے بے قرار کر دیا۔ وہ سوچنے لگا اور سوچنا بہت اچھی بات ہے۔ اچھی سوچ اِنسان کو نیک اور بڑا اِنسان بنا دیتی ہے۔

عید میں دو تین دن باقی تھے کہ مُحسن اپنی امّی سے کہنے لگا "امّی جان، میں عید مناؤں گا نہ نئے کپڑے ہی پہنوں گا؟"

ماں نے حیران ہو کر پُوچھا "بیٹا، ایسی بات مُنہ سے نہیں نکالا کرتے۔ تم عید کیوں نہیں مناؤ گے؟"

مُحسن: بس، میرا دل نہیں مانتا۔

ماں: تمھارا دل کیوں نہیں مانتا؟

محسن: اِس کی ایک وجہ ہے۔

ماں: میرے لعل، وہ وجہ کیا ہے؟

محسن: میں دل کی بات تب بتاؤں گا جب آپ وعدہ کریں کہ آپ میرے دل کی بات مان لیں گی۔

ماں: میں تو اپنے لختِ جگر پر جان قُربان کر دوں۔ اُس کی بات کیوں نہ مانوں گی؟

محسن: آپ نے وعدہ کیا ہے تو اُسے پُورا کرنا ہو گا کیوں کہ سچّے مسلمان عہد نہیں توڑتے۔

ماں: مُنہ سے بولو تو سہی۔ میں اِن شاء اللہ اپنا وعدہ ضرور پورا کروں گی۔

محسن: امّی جان، آپ جانتی ہیں کہ شکور میرا بہت پیارا دوست ہے۔ اُس نے بھی میری طرح سارے روزے رکھے ہیں، لیکن....."

ماں: لیکن کیا؟

محسن: اُس کے ماں باپ غریب ہیں۔ وہ ایسے کپڑے کیسے پہنے گا؟

ماں: میں سمجھی۔ تم فِکر نہ کرو۔ میں آج ہی تُمھارے ابّو سے کہوں گی کہ تمھیں اور شکور کو بازار لے جائیں اور وہ تمام چیزیں جو اُنھوں نے تمھیں خرید کر دی ہیں، شکور کو بھی خرید کر دیں۔

محسن: امّی جان، آپ کتنی اچھی ہیں۔

ماں: میرا بیٹا بھی تو بہُت اچھا ہے۔

مُحسن کی خوشی کی اِنتہا نہ تھی۔ اُسی روز، اِفطار کے بعد، مُحسن کے ابّو شکور کو ساتھ لے کر بازار گئے اور شکور کی پسند کے کپڑے، جُوتے، ٹوپی، رومال اور عطر خرید کر اُسے دیے۔ شکور بہُت خوش ہُوا۔ محسن نے اپنے باپ سے کہا:

"ابّا جان، شکور کو عیدی بھی دیں، بلکہ میری عیدی بھی اِسے ہی دے دیں تاکہ اِس کے بہن بھائی بھی عید مناسکیں"۔

مُحسن کی یہ بات سُن کر اور اُس کا اِیثار دیکھ کر اُس کے باپ کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے چھلک پڑیں۔ اُنھوں نے شکور کو پانچ سو روپے دیے۔ اِن روپوں سے اُس کے گھر میں عید ہو گئی۔ اُس کے والِدین نے مُحسن کو گلے لگایا اور اُسے اور اُس کے باپ کو اِتنی دُعائیں دیں کہ خوشی سے سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

بات صِرف 500 روپے کی نہیں تھی، ہمدردی، دوستی اور اِیثار کے جذبے کی تھی جو ربِّ رحمٰن کو بہُت پسند آئی۔ اُس رات مُحسن کے ابّو نے خواب میں دیکھا کہ ایک نہایت خوب صورت باغ ہے، اُس میں پھل دار درخت ہیں، رنگا رنگ پھولوں سے آراستہ پودے ہیں اور ٹھنڈے میٹھے پانی کی نہریں جاری ہیں۔ یہ بڑا ہی حَسین اور دِلکش منظر تھا۔ باغ کے بیچ ایک خوب صورت محل تھا، جو لعل و اِلماس اور نیلم و زُمرّد کا بنا ہُوا تھا۔ مُحسن کے ابّو نے اُسے دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ وہ اِسی عالَمِ حیرت میں تھے کہ اُن کو کسی نے آواز دی۔ اُنھوں نے مُڑ کر دیکھا تو ایک فرشتہ، اِنسان کی صورت میں، اُن کے پاس کھڑا تھا۔ اُس نے کہا:

"اے مُتّقی اِنسان! ربِّ رحمٰن کو تُمھارا جذبۂ اِحسان و اِیثار بہُت پسند آیا ہے۔ اُس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمھیں یہ خوش خبری سُناؤں کہ یہ باغ اور یہ محل تمھارے، تمھاری بیوی اور تمھارے بیٹے مُحسن کے نام لِکھ دیا گیا ہے۔ یہاں تم ہر روز عید منایا کرو گے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے"۔

Sharjeel Ahmed

سلیم خان گمی

میری زندگی کا ایک انوکھا واقعہ

اب جب کہ میں بُوڑھا ہو رہا ہوں، مجھ سے روزنامہ "روز و شب" کے اڈیٹر نے کہا ہے کہ میں اُن کے اخبار کے لیے اپنی زندگی کا کوئی یادگار واقعہ تحریر کروں۔ اُنہوں نے یہ بھی شرط لگائی ہے کہ یہ واقعہ نادِر یعنی انوکھا ہو۔ یہ ایک کڑا اِمتحان ہے۔ ایک واقعہ کسی شخص کے لیے یادگار تو ہو سکتا ہے لیکن اُس کا نادِر ہونا مُشکل ہے، کیوں کہ وُہی واقعہ یا حادِثہ کسی اور کو بھی پیش آ سکتا ہے یا آ چکا ہوتا ہے۔ اِس لیے یہ کہنا کہ جو واقعہ یا حادِثہ میں بیان کر رہا ہُوں، وہ نادِر بھی ہو گا ناممکن نہیں تو مُشکل ضرور ہے۔

یہ بتاتا چلوں کہ میرے والِد افضل خاں لڑک پن ہی میں لندن چلے گئے تھے۔ شروع شروع میں تو وہ جو کام مِل جاتا کرلیتے، پھر گودی میں کام کرنے لگے اور بحری جہازوں پر سامان لادنا اور اُتارنا اُن کا پیشہ ہوگیا۔ وہ کچھ عرصہ دریائے ٹیمز میں کشتی رانی بھی کرتے رہے تھے۔ یُوں دیکھا جائے تو اُن کا واسطہ زیادہ تر پانی سے رہا۔ سارا دِن کام کرنے کے بعد وہ رات کو ساؤتھ ہال آ جاتے جو لندن کا ایک مُحلّہ ہے اور یہاں زیادہ تر ایشیائی اور افریقی لوگ رہتے ہیں۔

وہ ایک چینی خاتون کے پاس کرائے دار کے طور پر رہتے تھے اور اُس سے چینی زبان بھی سیکھتے تھے۔ وہ انگریزی زبان اچھی طرح جانتے تھے اور اُنہوں نے پرائیویٹ انگریزی زبان کے اِمتحان بھی دیے تھے۔ اور پھر ایک وقت آیا کہ وہ بی بی سی کی مشرقی سروس میں بطور پروگرام پروڈیوسر بھرتی ہوگئے۔ اُس وقت اُن کی عُمر 25 برس تھی۔ اگلے سال اُن کی ایک خوش حال گھرانے میں شادی ہوگئی۔ یہ گھرانا پاکستان کے شہر سیال کوٹ سے آکر ساؤتھ ہال میں آباد ہوگیا تھا۔

شادی کے ڈیڑھ سال بعد مَیں پیدا ہُوا اور میرے والِد نے میرا نام عادِل رکھا۔ میں دس سال کی عُمر تک لندن میں رہا۔ چینی اور اُردُو کے اُستاد میرے والِد تھے اور انگریزی میں اِسکول میں پڑھتا تھا۔ اور پھر میرے والِد کا تبادلہ بی بی سی کے دفتر ہانگ کانگ میں ہوگیا، جہاں رُوس کے خِلاف پروپیگنڈے کے لیے ریڈیو اِسٹیشن قائم کیا گیا تھا۔

"ہم تو لندن میں ہی رہیں گے۔ ہانگ کانگ نہیں جائیں گے" میری والِدہ نے کہا۔

"کیوں؟" والِد نے پُوچھا۔

"تبادلہ آپ کا ہُوا ہے، میرا اور عادِل کا نہیں" امّی نے کہا۔

"تُم نے دُرست کہا، لیکن جہاں میاں وہاں بیوی اور بچّہ" ابّا جی نے ہنس کر کہا۔

"یہ بات پاکستان میں دُرست ہوگی، اِنگلستان میں نہیں" امّی نے جواب دیا۔

"کیا اِنگلستان میں یہ دستُور ہے کہ میاں الگ اور بیوی بچّے الگ رہیں؟" ابّا جی نے پُوچھا۔

"نہیں، یہ دستُور تو نہیں، لیکن ہم لندن میں آرام سے رہ سکتے ہیں۔ لندن بہُت خوب صورت اور صاف سُتھرا شہر ہے۔ اور پھر عادِل کی تعلیم کا حرج ہوگا۔ وہاں بھلا ایسے اِسکول کہاں ہوں گے، جیسے لندن میں ہیں۔ آپ مہینے بھر کا خرچہ بھیج دیا کریں۔ اللہ اللہ خیر سلا"۔

"مجھے کوئی اِعتراض نہیں۔ تم لندن میں رہو، میں ہانگ کانگ میں رہوں گا۔ ویسے ہانگ کانگ بھی اِنگلستان کی طرح بہُت خوب صورت اور صاف سُتھرا ملک ہے۔ وہاں بھی انگریزوں کی حکومت ہے اور بہت اچھّے انگریزی اِسکول بھی ہیں۔ ہاں، آبادی چینیوں کی زیادہ ہے کیوں کہ ہانگ کانگ دراصل چین ہی کا حصّہ ہے"۔ ابّا جی نے کہا۔

"چینی کیسے لوگ ہیں؟" امّی نے پُوچھا۔ ابّا جان چینیوں کو بہُت پسند کرتے تھے، کیوں کہ کئی سال چینی خاتون کے پاس رہ چکے تھے اور اُس سے اُنھوں نے چینی زبان سیکھی تھی۔

"چینی لوگ چین کے ریشم کی طرح طبیعت کے نرم اور بہُت مُہذّب ہوتے ہیں۔ وہ ایک دم نمبرون لوگ ہیں۔ بہُت محنتی، بہُت خوش اَخلاق اور بہُت دلیر" ابّا جان نے کہا۔

عین اُس وقت میرے مُنہ سے نکلا "ممی" ہم ہانگ کانگ جائیں گے"۔

چُناں چہ میری ضِد دیکھ کر امّی بھی ہانگ کانگ جانے کے لیے تیّار ہوگئیں اور ہم ایک مہینے بعد ہانگ کانگ چلے گئے۔

ہانگ کانگ کے دارُالحکُومت وکٹوریا میں ہمیں ایک چھوٹا سا خوب صورت مکان مِل گیا جو ابّا جی کے دفتر کے قریب تھا۔ مجھے ایک انگریزی اِسکول میں داخل کرا دیا گیا، اور اِس طرح ہمارے گھرانے کے لوگوں کی زندگی ایک خاص ڈگر پر چل پڑی۔

ایک دن چھُٹّی تھی۔ اِس لیے طے پایا کہ سیر کی جائے۔ چُناں چہ ہم تینوں ناشتا کر کے گھر سے چل پڑے۔ ابّا جی ہمیں ایک جھیل دکھانا چاہتے تھے۔ ہم لوگ ٹیکسی سے اُترے تو سامنے مچھلی منڈی تھی جہاں قسم قسم کی مچھلیاں بِک رہی تھیں۔ ہم مچھلیاں دیکھتے رہے اور آگے بڑھتے رہے۔ ایک جگہ میں نے ریڑھیوں میں سرکٹے سانپ دیکھے تو حیرت سے اُچھل پڑا۔

"ابّا جان، یہ کون سی مچھلی ہے؟" میں نے پُوچھا۔

"بیٹا" یہ مچھلی نہیں، سانپ ہیں۔ پانی کے سانپ" ابّا جی نے بتایا۔

"پانی کے سانپ؟ میں سمجھا نہیں" میں نے کہا۔

"جس طرح مچھلیاں پانی میں رہتی ہیں، اِسی طرح یہ سانپ بھی پانی میں رہتے ہیں"۔ ابّا جی نے بتایا۔

"یہ زہریلے نہیں ہوتے؟" امّی جان نے پوچھا۔

"اِن میں سے کچھ کم زہریلے ہوتے ہیں اور کچھ زیادہ۔ لیکن ایک بات ہر سانپ کے بارے میں دُرست ہے۔ خواہ وہ کم زہریلا ہو یا زیادہ زہریلا"۔

"وہ کیا؟" میں نے پُوچھا۔

"سانپ کا زہر اُس کے سر میں ہوتا ہے۔ سر کاٹ دو تو زہر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ جو سانپ بِک رہے ہیں، اِن سب کے سر کٹے ہوئے ہیں" ابّا جی نے ایک ریڑھی کی طرف اِشارہ کیا۔

"ہاں، اِن سب کے سر کٹے ہوئے ہیں" امّی نے کہا۔

"اِس کا مطلب ہے کہ اِن سانپوں میں زہر نہیں ہے۔ چینی لوگ اِن کو بھُون کر کھاتے ہیں یا شوربا تیّار کرتے ہیں۔ اِن کا سالن اور سُوپ ہوٹلوں میں عام بِکتا ہے"۔

"اُف! توبہ! میرا تو سانپ کے سالن کا تصوّر کر کے ہی سر چکرانے لگا" امّی نے کہا۔

قریب تھا کہ امّی کی طبیعت خراب ہو جائے، ہم جلدی سے آگے بڑھ گئے۔ اِس کے بعد ہم نے جِھیل کی سیر کی اور پھر ایک ریسٹورنٹ میں جاکر برگر کھائے۔

چند دن بعد ابّا جی کا شُعبہ بدل گیا۔ پہلے وہ چینی زبان کے ڈرامے پیش کرتے تھے، اب اُن کو چینی زبان کا دیہاتی پروگرام دیا گیا۔ اِس پروگرام میں دیہات میں رہنے والے کھیت مزدُوروں، چرواہوں، کسانوں، ماہی گیروں، شکاریوں، ریشم کے کیڑے پالنے والوں، مِستریوں، مویشیوں کا عِلاج کرنے والوں اور سرکاری کارندوں سے اِنٹرویو کرنا پڑتے تھے۔ پہلا اِنٹرویو ایک ایسے شکاری کا تھا جو جِھیل سے سانپ پکڑ کر فروخت کرتا تھا!

جس روز ابّا جی کا شُعبہ بدلا، اُس کے اگلے روز اُنہیں وِکٹوریا سے دس میل دور اِنٹرویو کے لیے جانا تھا، اُس شکاری کے گاؤں تک ریڈیو اِسٹیشن کی گاڑی میں سفر کرنا تھا اور اِس کے بعد کشتی میں بیٹھ کر جانا تھا۔ میرے اِسکول میں چُھٹّی تھی چُناں چہ میں نے ضِد کی کہ میں بھی اُن کے ساتھ جاؤں گا اور میری ضِد کے سامنے اُن کو ہار ماننا پڑی۔

دوسرے دن دوپہر سے پہلے ہم شکاری کے گاؤں لوانگ پہنچ گئے۔ شکاری کا نام کن من شن تھا۔ اُس کی عُمر چالیس برس ہوگی۔ قد درمیانہ لیکن گٹھا ہُوا تھا۔ چہرے کی رنگت پیلی تھی اور ٹھوڑی پر لمبے لمبے بال تھے۔ کن من شن نہایت تپاک سے ملا۔ اُس کو ایک ہفتہ پہلے اِطّلاع مِل چکی تھی کہ اُس کا اِنٹرویو ہوگا اور دیہاتی پروگرام سُننے والوں کو بتایا جائے گا کہ وہ کس طرح سانپوں کا شکار کرتا ہے اور اُسے ترقّی پسند شکاری کیوں کہا جاتا ہے۔ شکاری تو خیر ہم لوگ کہتے ہیں۔ ہانگ کانگ میں تو اُن کو کاشت کار کہا جاتا ہے، ترقّی پسند کاشتکار، کیوں کہ وہ لوگ سانپ پالتے ہیں اور پھر اُن کو مارکیٹ میں فروخت کرتے ہیں۔ گویا وہ سانپوں کی فصل بوتے ہیں اور پھر کاٹتے ہیں۔

ابّا جی نے اُس کی بات چیت ریکارڈ کی اور پھر ہم اُس کی کشتی میں بیٹھ کر چل پڑے تاکہ دیکھا جائے کہ وہ سانپ کیسے پکڑتا ہے۔ اُس کی کشتی میں دو بوریاں، ایک چھڑی اور ایک درانتی تھی۔ چند رسّیاں اور ڈوریاں بھی تھیں۔ سانپ پکڑنے کے لیے تانت کی بنی ہوئی جالی تھی جیسی تِتلیاں پکڑنے کے لیے ہوتی ہے۔ جالی کا ایک سرا بند تھا اور ایک کُھلا۔ کُھلا سرا ڈنڈے کے ساتھ منڈھا ہوا تھا۔ شکاری ڈنڈے کو پکڑ کر جالی کو جھیل کے پانی میں ڈبوتا اور پھر اُوپر اُٹھاتا ہے۔ پانی جالی کے سوراخوں میں سے نکل جاتا ہے اور سانپ جالی میں رہ جاتے ہیں۔ شکاری جالی کو بوری کے مُنہ میں ڈال کر ہلاتا ہے تو سانپ بوری میں گر جاتے ہیں۔ بوری کا کُھلا مُنہ ایک دُوسرا شخص بند کر دیتا ہے اور اُسے پکڑے رہتا ہے۔

"وہ دُوسرا شخص کون ہے جو بوری کو پکڑے گا؟" ابّا جی نے کن من شن سے پُوچھا۔ اُس وقت کشتی تیزی سے گہرے پانی کی طرف جا رہی تھی۔

"آپ، اور کون؟" کن من شن نے کہا۔

"میں؟ نہیں، نہیں۔ میں یہ کام نہیں کر سکتا" ابّا جی گھبرا کر بولے۔

"میں آپ کو زحمت نہ دیتا، لیکن میرا بیٹا بیمار ہے۔ بیوی اُس کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔ اِس لیے وہ بھی میرے ساتھ نہیں آسکتی تھی" سانپوں کے شکاری نے مسکرا کر کہا۔

"میں نے یہ کام پہلے کبھی نہیں کیا" ابّاجی نے بتایا۔

"پھر کیا ہُوا؟ کون سا مُشکِل کام ہے۔ آپ صرف بوری کا مُنہ کھولیں گے اور بند کریں گے۔ سانپوں کو پانی میں سے پکڑنا اور پھر بوری میں ڈالنا، اصل کام تو یہ ہے۔ اور یہ کام میں کروں گا" وہ بولا۔

"یہ سانپ زہریلے تو نہیں ہیں؟" ابّاجی نے پُوچھا۔

"زہریلے ہوتے بھی ہیں اور نہیں بھی ہوتے۔ ہم اُن کی زبان نہیں سمجھ سکتے۔ سمجھ سکتے تو پُوچھ لیتے کہ بھئی زہریلے ہو یا نہیں؟ اور زہریلے ہو تو کتنے؟" وہ پھر مسکرایا۔

"کتنے سانپ پکڑیں گے آپ؟" والِد نے کن من شن سے پُوچھا۔

"دو بوری۔ بس۔ نہ زیادہ نہ کم۔ چار پانچ دن پہلے میں اور میرا بیٹا سانپ پکڑنے آئے تھے، لیکن ایک سانپ نے میرے بیٹے کو ڈس لیا اور وہ بے ہوش ہوگیا۔ لاچار مجھے خالی ہاتھ واپس جانا پڑا۔ آج تو میں ہرگز خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا" اس نے کہا۔

"آپ ایک دو دِن صبر نہیں کر سکتے؟" ابّاجی نے پُوچھا۔

"آج کل سانپ پکڑنے کا موسم ہے۔ منڈی میں سانپوں کی قیمت میں تیزی آگئی ہے۔ اِس موسم میں سانپ کا سالن اور سُوپ خوب بِکتا ہے۔

"اِس لیے میں ایک دِن کیا ایک گھنٹا بھی اِنتظار نہیں کر سکتا" کن من شن نے کہا۔ اِس بار اُس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب تھی!

ابّاجی نے دوسری بات نہ کی اور بوری پکڑلی۔ کن من شن نے جالی اُٹھائی اور سانپ پکڑنے لگا۔ اُس کا طریقہ وہی تھا جس کا ذکر میں کر چکا ہُوں۔ ابّاجی جلدی جلدی بوری کا مُنہ کھول اور بند کر رہے تھے۔ وہ بے حد گھبرائے ہوئے تھے اِن کا مُنہ فق تھا۔

اور پھر وُہی ہُوا جس کا خطرہ تھا۔ بوری آدھی بھر چکی تھی کہ ایک زہریلا سانپ بوری میں سے لپکا اور اُس نے ابّاجی کی کلائی پر مُنہ مارا۔ ابّاجی چیخے۔ کن من شن نے بجلی کی

ی تیزی سے بوری کے مُنہ پر ڈوری باندھی' پھر ابّاجی کی نبض دیکھی اور مجھ سے کہا:

"بچّے' گھبراؤ نہیں۔ تمھارے ابّاجی زندہ ہیں۔ بس ذرا ڈر کر بے ہوش ہو گئے ہیں۔ ویسے بھی اِن سانپوں کا ڈسا ہُوا 24 گھنٹے زندہ رہتا ہے' اور ہم تو دو ڈھائی گھنٹے میں فارِغ ہو جائیں گے"۔

یہ کہ کر اُس نے بوری کا مُنہ کھولا اور پھر میری طرف بڑھ کر بولا "لو' پکڑو اِسے!"

میں نے سر ہِلا کر اِنکار کیا تو وہ غُصّے سے بولا "اگر تُم نے بوری نہیں پکڑی تو میں اِسے کشتی میں اُلٹ دُوں گا اور سانپ تمہیں کچّا کھا جائیں گے"۔

آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اُس وقت میری کیا حالت ہو گی۔ ابّاجی زندگی اور موت کی دہلیز پر تھے اور مجھے موت کے مُنہ میں دھکیلا جا رہا تھا۔ میں نے خدا کو یاد کیا اور بوری کا مُنہ پکڑ لیا۔ کن من شن سانپ پکڑ پکڑ کر بوری میں ڈالنے لگا۔

دو ڈھائی گھنٹے بعد دونوں بوریاں سانپوں سے بھر گئیں اور ہم واپس چل پڑے۔ کن من شن کے گاؤں آ کر میں نے ابّاجی کے ٹیپ ریکارڈر اور مائیکروفون کو گاڑی میں رکھا اور ہم شہر روانہ ہو گئے۔

وکٹوریا پہنچ کر ابّاجی کو ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ میں نے ریڈیو اِسٹیشن جا کر سانپ پکڑنے کا آنکھوں دیکھا حال اپنی آواز میں ریکارڈ کروایا جو اگلے دن نشر ہُوا۔ بعد میں یہ پروگرام سال کا بہترین پروگرام قرار دیا گیا۔

ہاں' یاد آیا۔ ابّاجی پندرہ دن کے اندر اندر صحّت یاب ہو گئے۔ تو دوستو' یہ تھا میری زندگی کا نادِر یعنی انوکھا اور عجیب واقِعہ!

یادگارِ قراردادِ پاکستان

آج سے 53 سال پہلے' 23 مارچ 1940ء کو' لاہور کے شاہی قلعے اور بادشاہی مسجد کے قریب منٹو پارک میں آل اِنڈیا مسلم لیگ کا ایک بہُت بڑا جلسہ ہُوا تھا' جس کی صدارت قائدِاعظم محمّد علی جناح نے کی تھی۔ اِس تاریخی جلسے میں شیرِ بنگال مولوی فضلُ الحق نے ایک قرارداد پیش کی تھی جس میں انگریزوں سے مُطالبہ کیا گیا تھا کہ ہندوستان کے جِن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریّت ہے اُنہیں مِلا کر ایک آزاد اور خود مُختار اِسلامی مُلک بنایا جائے۔

پہلے پہل اِس قرارداد کو "قرار دادِ لاہور" کا نام دیا گیا' لیکن بعد میں یہ "قراردادِ پاکستان" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اِس قرارداد نے ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک نئی رُوح پھونک دی اور آخر 14۔ اگست 1947ء کو وہ اپنے لیے ایک آزاد اِسلامی مُلک (پاکستان) حاصِل کرنے میں کام یاب ہو گئے۔

حکومتِ پاکستان کو اِس تاریخی قرارداد کی اہمیّت کا اِحساس تھا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ اُس جگہ جہاں مسلم لیگ کا یہ جلسہ ہُوا تھا' ایک ایسی یادگار تعمیر کی جائے جو ہمیں رہتی دُنیا تک اِس قرارداد کی یاد دلاتی رہے۔ چُناں چہ حکومت نے منٹو پارک میں (جو اَب اِقبال پارک کے نام سے مشہور ہے) ایک عالی شان مینار تعمیر کرایا اور اُس کا نام "یادگارِ قراردادِ پاکستان" رکھا۔ اِس مینار کا نقشہ ایک تُرک اِنجینئر نصرُ الدّین مُراد خان نے تیّار کیا تھا۔ مارچ 1960ء میں اِس کا سنگِ بُنیاد رکھا گیا اور 1968ء میں یہ مکمّل ہو گیا۔

اب اِسے عمُوماً مینارِ پاکستان کہا جاتا ہے۔

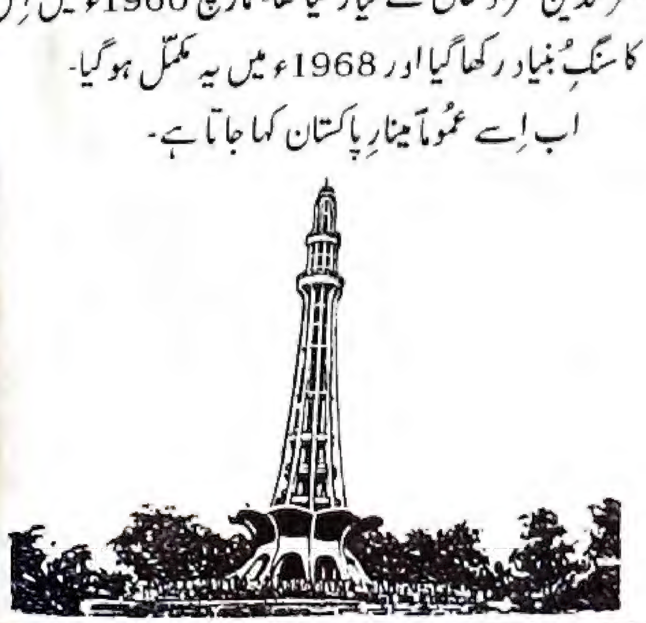

اسپیشل بچّے

محمّد فارُوق انجم

گلی میں بچّے فُٹ بال کھیل رہے تھے۔ اُنھوں نے کھیل کے ساتھ ساتھ شور و غُل بھی مچا رکھا تھا۔ وہ کُل آٹھ تھے۔ چار دائیں طرف اور چار بائیں طرف۔ اُن کے درمیان میچ ہو رہا تھا۔

شکیل کِھڑکی میں کھڑا اُن کو کھیلتا ہُوا دیکھ رہا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور نگاہیں اُن خوش و خُرّم بچّوں پر جمی تھیں، جو فُٹ بال کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ دائیں طرف والی ٹیم گول کرنے میں کام یاب ہوئی تو وہ خوشی سے ناچنے لگی اور گلی میں پہلے سے زیادہ شور مچ گیا۔

شکیل بھی خوشی سے تالی بجانے لگا لیکن پھر اچانک اُس کے ہاتھ رُک گئے، ہونٹوں کی مسکراہٹ غائب ہوگئی اور چہرہ مُرجھا سا گیا۔ اُس نے گلی سے نگاہیں ہٹا کر اپنی ٹانگ کی طرف دیکھا جو پیدائشی کم زور تھی۔ پھر اُس نے اپنی بغل میں دبی ہوئی بیساکھی کی طرف دیکھا جس کے سہارے وہ چلتا تھا۔ اُس نے ٹھنڈی آہ بھر کے کھڑکی بند کر دی اور بیساکھی کے سہارے چلتا ہُوا صحن میں آگیا جہاں اُس کی امّی بیٹھی چاول صاف کر رہی تھیں۔

اُسے اُداس دیکھ کر امّی نے پُوچھا "شکیل بیٹے، کیا ہُوا؟"

"کچھ نہیں، امّی" اُس نے بات ٹالنا چاہی۔

"کچھ بات تو ہے" امّی اس کا گہری نظروں سے جائزہ لے رہی تھیں۔

شکیل کے چہرے پر اُداسی چھائی ہُوئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ بولا "امّی، میں دُوسرے بچّوں کی طرح فُٹ بال کیوں نہیں کھیل سکتا؟"

امّی سوچنے لگیں کہ اِس کی بات کا کیا جواب دیں۔ پھر وہ بولیں "بیٹا، تمھیں پڑھ لِکھ کر بہُت بڑا آدمی بننا ہے، بننا ہے نا؟"

"میں بڑا آدمی بھی نہیں بن سکتا" شکیل اور اُداس ہوگیا۔

"کیوں نہیں بن سکتے؟ محنت سے ہر چیز حاصِل کی جا سکتی ہے"۔

"کل کلاس میں عدیل نے مُجھ سے پُوچھا کہ تُم بڑے ہو کر کیا بنو گے تو میں نے کہا کہ پائلٹ بنوں گا۔ پتا ہے عدیل نے کیا جواب دیا؟" شکیل نے امّی کی طرف دیکھا۔

"کیا جواب دیا؟"

"وہ بولا، لنگڑا کبھی پائلٹ نہیں بن سکتا" وہ یہ کہہ کر چُپ ہوگیا۔ اُس کے اُداس اور اُترے ہوئے چہرے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ وہ کس اذیّت سے گزر رہا ہے۔

"دیکھو بیٹا، انسان کو دل چھوٹا نہیں کرنا چاہئیے" امّی نے سمجھایا "انسان اُونچا مقام اپنی محنت سے حاصل کرتا ہے۔ دوسروں کی باتوں میں آکر ہمّت ہارنا اچھّی بات نہیں ہے"۔

"امّی، میں تو معذور ہوں نا"۔

"معذور مجبُور نہیں ہوتا۔ تم ایسا مت سوچا کرو۔ محنت کرو محنت، اور ہمّت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو"۔

شکیل کی سمجھ میں امّی کی بات آگئی۔ کچھ دیر قبل اِس اِحساس نے اُسے افسُردہ کر دیا تھا کہ وہ معذور ہے، مگر اب امّی کی باتیں سُن کر اُس نے وہ اِحساس اپنے ذہن سے نکال دیا تھا اور اُس کا چہرہ افسُردہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

شکیل کی خواہش تھی کہ وہ پائلٹ بنے، کیوں کہ اُسے ہوائی جہاز بہُت اچھّے لگتے تھے۔ جب وہ کسی جہاز کو اُڑتا ہوا دیکھتا تو اُس کی پائلٹ بننے کی خواہش اُسے بے چین کر دیتی۔

ایک دن اُسے ایک ہوائی جہاز اُڑتا ہوا نظر آیا تو وہ بڑے شوق سے اُسے دیکھنے لگا۔ وہ خیال ہی خیال میں دیکھ رہا تھا کہ اِس جہاز کو وُہی اُڑا رہا ہے۔ اُس نے پائلٹ کی وردی پہن رکھی ہے۔ وائرلیس پر باتیں بھی کرتا جا رہا ہے۔

"کیا دیکھ رہے ہو، شکیل؟" امّی نے پُوچھا۔ جہاز گزُر چُکا تھا مگر شکیل کا مُنہ ابھی تک آسمان کی طرف اُٹھا ہوا تھا۔

"جہاز دیکھ رہا تھا، امّی" شکیل چونک کر بولا۔

"جہاز تو گزُر چکا ہے"۔

"میں بھی جہاز اُڑاتا ہُوا کسی دن یہاں سے گزُروں گا۔ آپ دیکھیں گی نا، امّی؟" شکیل بولا۔

"ہاں، ضرور دیکھوں گی، بیٹا" امّی مسکرا کر بولیں۔ مگر وہ شکیل کی بات سُن کر رنجیدہ ہوگئی تھیں۔

"امّی، آپ کبھی جہاز میں بیٹھی ہیں؟"

"نہیں، بیٹے"۔

"کوئی بات نہیں۔ جب میں پائلٹ بنوں گا تو آپ کو جہاز میں بٹھا کر خوب سیر کراؤں گا" یہ کہہ کر شکیل نے اپنے بازو پھیلا لیے مگر دوسرے ہی لمحے اُس کی بغل میں دبی ہوئی بیساکھی نیچے گر گئی۔ اُس نے گری ہوئی بیساکھی کی طرف دیکھا تو اُس کا کِھلا ہُوا چہرہ ایک دم مُرجھا گیا۔ امّی بھاگ کر آگے بڑھیں، بیساکھی اُٹھا کر اُسے دی اور مسکراتے ہوئے بولیں "تم مجھے کہاں کہاں کی سیر کراؤ گے؟"

شکیل بُجھی بُجھی آنکھوں سے امّی کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر بغیر جواب دیے بیساکھی کے سہارے ٹھک ٹھک کرتا ہُوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اِسکول میں تفریح کی چُھٹّی ہُوئی تو سب بچّے بھاگتے، شور مچاتے، کلاس رُوم سے باہر نکلنے لگے۔ شکیل اپنی جگہ چُپ چاپ بیٹھا رہا۔ وہ کلاس رُوم سے اُس وقت نکلتا تھا جب سب بچّے نکل جاتے تھے۔ کلاس خالی ہوگئی تھی۔ شکیل کے عِلاوہ صِرف عدیل اور اُس کے تین دوست کلاس رُوم میں رہ گئے تھے۔

"او لنگڑے، تم باہر نہیں جاؤ گے؟" عدیل بڑی بدتمیزی سے بولا "باہر جا کر کچھ کھا پی آؤ"۔

"کھانے پینے سے کیا اِس کی ٹانگ ٹھیک ہو جائے گی؟" عدیل کا ایک ساتھی بولا۔ اس پر وہ سب پاگلوں کی طرح ہنسنے لگے جیسے اُس نے کوئی لطیفہ سُنایا ہو۔ شکیل چُپ رہا۔

"ایک بات تو بتاؤ، شکیل لنگڑے۔ تُم تعلیم حاصل کرنا کیوں چاہتے ہو؟" عدیل نے پوچھا "پڑھ لِکھ کر کیا بنو گے؟"

"پائلٹ......" شکیل کہتے کہتے رُک گیا۔ عدیل اور اُس کے ساتھی ہنسنے لگے۔

"تم پائلٹ نہیں بن سکتے۔ میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا، تم معذور ہو۔ پڑھائی چھوڑ کر کسی کام پر لگ جاؤ"۔

"شاید یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں" عدیل اور اُس کے ساتھیوں کے جانے کے بعد شکیل نے سوچا اور بستہ اُٹھا کر بیساکھی کے سہارے کلاس رُوم سے باہر آگیا۔

اُسی وقت ایک ہوائی جہاز اُڑتا ہُوا اُدھر سے گزُرا۔ وہ

پہلے ہر اُڑتا ہُوا جہاز دیکھتا تھا، مگر اب اُس نے مُنہ اُٹھا کر اُسے نہیں دیکھا۔

وہ تفریح کے وقت ہی گھر آگیا تھا۔ اُس نے غُصّے سے بستہ ایک طرف پھینکا اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔ امّی کو تشویش ہُوئی کہ اِس کو کیا ہُوا جو اِسکول سے نہ صِرف جلدی آگیا بلکہ افسُردہ اور اُداس بھی ہے۔

"کیا ہُوا، بیٹے؟" اُنھوں نے پوچھا۔

"میں کل سے اِسکول نہیں جاؤں گا"۔

"کیوں؟"

"میں پڑھ لکھ کر پائلٹ نہیں بن سکتا"۔

"کیسے نہیں بن سکتے؟"

"میں معذُور ہوں"

امّی سمجھانے لگیں "غلط کہا ہے تُم سے کسی نے....."

شکیل نے امّی کی بات کاٹ دی "خیر، اب میں اِسکول تو ہرگز نہیں جاؤں گا۔ کوئی کام سیکھوں گا"۔

امّی نے تو چاہا کہ وہ اُسے سمجھائیں مگر عدیل کی باتوں نے اُس کے اندر اِتنا زہر بھر دیا تھا کہ وہ کوئی بات اور کوئی دلیل سُننے کو تیّار نہ تھا۔ اُس کے کانوں میں صِرف ایک ہی آواز آرہی تھی کہ تُم..... معذور ہو..... تم معذور ہو۔ اُس کے ابّو کراچی میں مُلازمت کرتے تھے۔ وہ ہوتے تو شاید اُسے سمجھاتے مگر وہ شاید پھر بھی نہ سمجھتا کیوں کہ لڑکوں نے اُس کے دل میں یہ بات بٹھادی تھی کہ وہ معذُور ہے۔

شکیل کی امّی کی ایک نہ چلی تو وہ رنجیدہ ہوکر چُپ ہوگئیں۔ دوسرے دن شکیل اِسکول جانے کی بجائے ٹیلی ویژن مرمّت کرنے کی دُکان پر چلا گیا۔ وہ دُکان اُسی گلی میں رہنے والے ایک آدمی کی تھی۔ شکیل نے اُس سے کام سیکھنے کی بات کرلی تھی۔

تین دن تک وہ اِسکول نہ آیا تو اُس کے کلاس ٹیچر کو فکر ہوئی۔ وہ ایک نیک اور خُدا ترس انسان تھے۔ چُھٹّی کے بعد وہ شکیل کے گھر گئے اور دروازے پر دستک دی تو شکیل کی امّی نے پُوچھا "کون ہے؟"

"بہن جی، شکیل میری کلاس میں پڑھتا ہے" ماسٹر صاحِب بولے "یہ پوچھنے کے لیے آیا تھا کہ خیریّت تو ہے؟ شکیل اِسکول نہیں آرہا"۔

"وہ اب پڑھنا نہیں چاہتا"۔ امّی بولیں۔

"کیوں؟ وہ تو بہُت محنتی اور ذہین بچّہ ہے" ماسٹر صاحِب نے کہا۔

تب شکیل کی امّی نے اُنھیں ساری کہانی سُنائی۔ ماسٹر صاحِب کو بہُت دُکھ ہُوا۔ اُنھوں نے کہا کہ شکیل کو لڑکے تنگ کرتے تھے تو اُس نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔ میں اِس کی روک تھام کرتا۔ وہ سیدھے دُکان پر گئے اور شکیل کو اپنے ساتھ پارک میں لے گئے۔

"شکیل میاں، لڑکے تمھیں تنگ کرتے تھے تو تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

"بتاتا تو تب جب کوئی فائدہ ہوتا"۔

"کیا مطلب؟"

سر' میں معذور ہُوں..... میں پائلٹ نہیں بن سکتا۔ پھر پڑھائی سے کیا فائدہ؟"

"معذُور ہونا کام یابی کی راہ میں رُکاوٹ نہیں ہے" ماسٹر صاحِب بولے "اِنسان اپنے اندر ہمت اور پُختہ اِرادہ پیدا کرلے تو منزل خود چل کر اُس کے پاس آ جاتی ہے"۔ چند لمحے رُک کر ماسٹر صاحِب پھر بولے "اگر تم پائلٹ نہیں بن سکتے تو کوئی اور پیشہ اِختیار کرسکتے ہو"۔

ماسٹر صاحِب شکیل کو اپنے ایک شاگرد ڈاکٹر اِعجاز کے کلینک میں لے گئے۔ شکیل یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ صحت مند جسم والا یہ ڈاکٹر اپنی دونوں ٹانگوں سے معذور ہے اور وہیل چیئر اِستعمال کرتا ہے۔ ماسٹر صاحِب نے شکیل کی طرف اِس طرح دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ دیکھو' ایک معذور بھی ڈاکٹر بن سکتا ہے۔

تھوڑی دیر ڈاکٹر اعجاز کے پاس بیٹھنے کے بعد وہ دونوں کلینک سے باہر آ گئے۔

"دیکھا تم نے ڈاکٹر اِعجاز کو؟" ماسٹر صاحِب نے پُوچھا۔

"جی" شکیل نے جواب دیا۔

"بیٹے' کسی کی باتوں میں آکر اپنا مُستقبِل برباد کرنا عقل مندی نہیں ہے۔ جنہیں کچھ حاصل کرنا ہوتا ہے' وہ ہمت و کوشش سے اپنی منزل پالیتے ہیں" ماسٹر صاحِب شکیل کو سمجھاتے ہوئے بولے۔ دونوں سڑک کے کنارے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔

"سر' اب میں سمجھ گیا ہُوں" شکیل بولا "اب میں ڈاکٹر بنوں گا تاکہ مُلک و قوم کی خدمت کرسکوں"۔ اُس کے اِرادے میں پُختگی تھی اور چہرے پر مایُوسی کا نام نِشان تک نہ تھا۔

"شاباش! بیٹے" ماسٹر صاحِب خوش ہوکر بولے "مایُوسی گُناہ ہے' اور کام یابی کی راہ میں بہت بڑی رُکاوٹ ہے۔ مایُوسی کو اپنے قریب تک نہ پھٹکنے دینا"۔

دوسرے دن شکیل کلاس رُوم میں حاضِر تھا۔ ماسٹر صاحِب حاضری لینے کے بعد شکیل کی طرف بڑھے' اُس کا بازو پکڑ کر اپنی کرُسی کے قریب لائے اور پھر کلاس کے بچّوں سے کہنے لگے:

"آپ کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ آپ معذُور نہیں ہیں۔ اور اِس بات پر شرمندہ ہونا چاہیئے کہ آپ ایک معذُور بچّے کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ ایسی باتیں کرتے ہیں جس سے وہ دِل برداشتہ ہو جائے"۔ چند لمحوں کے لیے ماسٹر صاحِب رُکے اور پھر بولے "شکیل جیسے بچّے ہمارے اِسپیشل بچّے ہیں۔ یہ ہماری زیادہ توجّہ' پیار اور دوستی چاہتے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے اِسپیشل بچّوں کو زیادہ سے زیادہ توجُّہ' پیار اور دوستی دیں۔ اُنہیں نفرت کی بجائے اتنی محبّت دیں کہ وہ اپنی معذوری بھُول جائیں اور زندگی کی دوڑ میں کسی سے پیچھے نہ رہیں"۔

کلاس رُوم میں خاموشی چھاگئی۔ جو بچّے شکیل کا مذاق اُڑاتے تھے' وہ اندر ہی اندر شرمندہ ہو رہے تھے اور دل ہی دل میں عہد کر رہے تھے کہ وہ آیندہ شکیل جیسے اِسپیشل بچّوں کو تنگ نہیں کریں گے۔ بلکہ ان کو اِسپیشل دوستی کا تحفہ دیں گے۔

"پیارے بچّو' آپ نے میری بات سُنی؟" ماسٹر صاحِب نے پُوچھا۔

"جی' سر" سب ایک زبان ہو کر بولے۔

"تو پھر عہد کیجیے کہ ہم کبھی بھی ایسے اِسپیشل بچّوں کو مذاق کا نشانہ نہیں بنائیں گے بلکہ ہر وقت' ہر لمحہ اور ہر موڑ پر اُن پر اپنا خلوص اور مَحبّت نِچھاور کریں گے تاکہ وہ محسُوس کریں کہ ہم دوسروں کے ساتھ قدم سے قدم مِلا کر چل رہے ہیں"۔

ماسٹر صاحِب نے اپنی بات ختم کی تو ساری کلاس اُٹھ کھڑی ہوئی۔ عدیل بولا "آیندہ ہم اِسپیشل بچّوں کی عِزّت کریں گے"۔

شکیل مسکرا رہا تھا۔ ماسٹر صاحِب کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ تھی۔

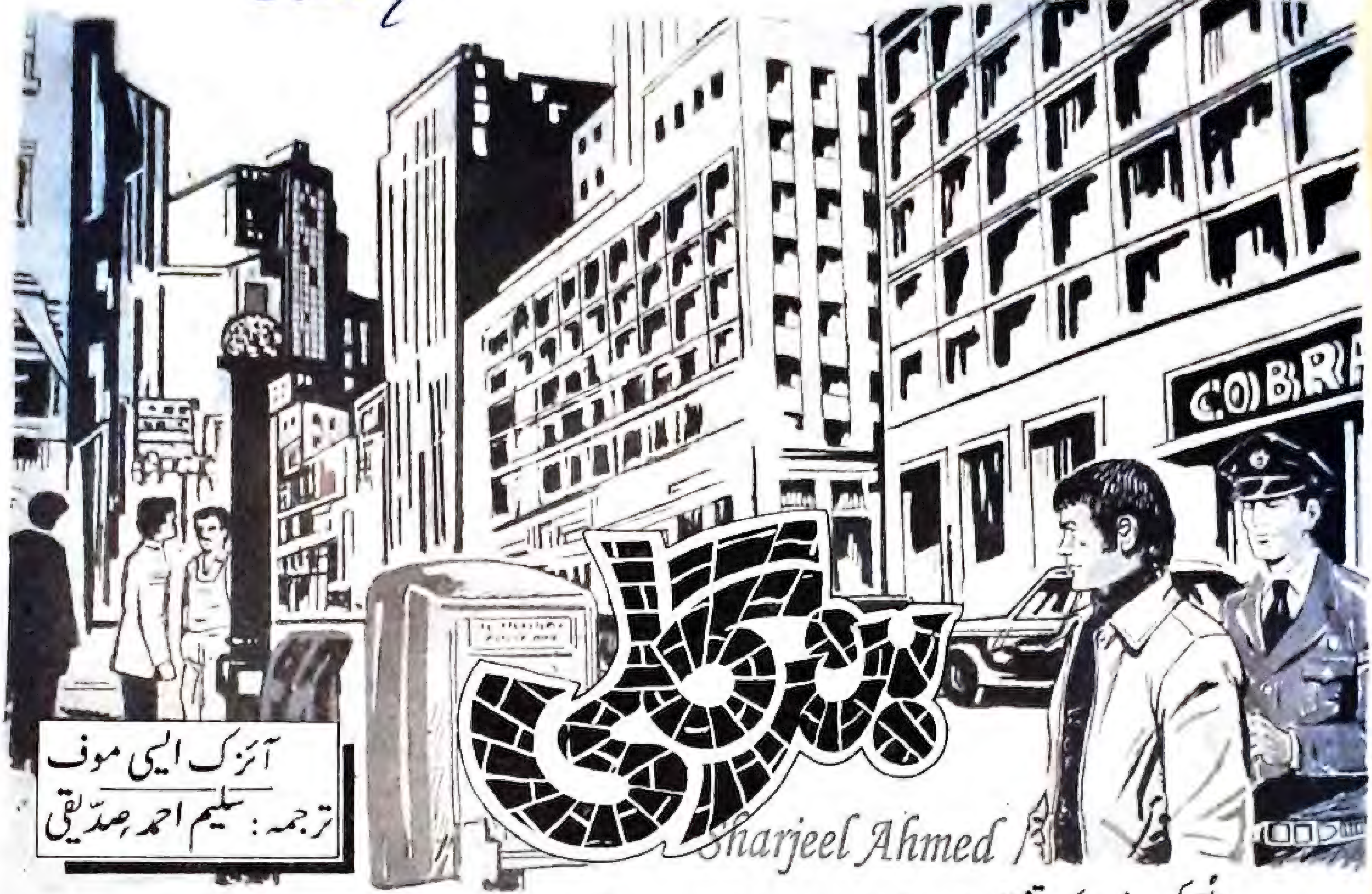

آئزک ایسی موف
ترجمہ: سلیم احمد صدیقی

جب ابّو کسی جُرم کی تفتیش میں مصروف ہوں تو میں اُس جگہ نہیں ٹھہرا کرتا، لیکن اِس بار مجھے ایسا کرنا پڑ ہی گیا۔

ایک دن میں اِسکول سے واپس آ رہا تھا کہ ایک آدمی مجھ سے تقریباً ٹکراتا ہُوا جلدی سے گلی میں گھُس گیا۔ یہ گلی آگے جاکر بند ہو جاتی تھی اور اِس میں دائیں بائیں اُونچی اُونچی عِمارتیں تھیں۔ میں نے سوچا کہ کسی چکّر میں نہ پڑوں اور سیدھا گھر کا راستہ لُوں۔

مگر ابھی ایک مِنٹ بھی نہ گزرا ہوگا کہ دو پولیس افسر دوڑتے ہوئے آئے، اور اِس سے پہلے کہ وہ مجھ سے کچھ پُوچھتے، میں خود ہی بول پڑا "وہ اُدھر گیا ہے"۔

اُن میں سے ایک دوڑتا ہُوا گلی کے اندر گیا، پھر باہر آیا اور چلّا کر دوسرے سے بولا "اُدھر ایک دروازہ کھُلا ہوا ہے۔ وہ اُسی کے اندر گیا ہے۔ تم سامنے کی جانِب سے آؤ"۔

اُنہوں نے وائرلیس پر پیغام بھیج دیا ہوگا، تب ہی تو چند مِنٹ کے اندر اندر پولیس کی تین کاریں موقع پر پہنچ گئیں۔ اُن میں سفید کپڑوں میں پولیس افسر بھی تھے۔ عمارت کو فوراً ہی گھیرے میں لے لیا گیا۔

مجھے معلوم تھا کہ اب مجھے یہاں سے چل دینا چاہیے۔ کیوں کہ راہ گیر تماشائی پولیس کی راہ میں رُکاوٹ بن جاتے ہیں۔ لیکن میری سُراغ رسانی کی عادت نے میرے پاؤں جکڑ لیے۔ میں نے پولیس کی گُفت گُو سے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ اِسٹاکٹن نامی ہیروں کے ڈاکو کا پیچھا کر رہے ہیں۔ اب کی بار اُس نے ایک بہُت بڑا ڈاکا ڈالا تھا۔ میں اُس کے نام سے واقِف تھا کیوں کہ ابّو پولیس کے سُراغ رسانی کے شُعبے میں افسر ہیں۔ وہ بھی اِس کیس کی تفتیش میں شامل تھے۔

"یہ بڑا چالاک شخص ہے" اُنہوں نے چند ہفتے پہلے مجھے بتایا تھا "لیکن یہ اکیلا کام کرتا ہے۔ اِسی لیے بچ نکلتا ہے۔"

میں نے کہا تھا "لیکن ابّو، وہ کسی نہ کسی سے تو ملتا ہوگا۔ مثلاً ہیرے بیچنے والا کوئی جوہری، جو اُس سے چوری کے ہیرے خریدتا ہوگا"۔

"اگر ایسا ہے" ابّو نے بتایا تھا "تو کم از کم ہم اُس شخص کا پتا نہیں جانتے۔ اور، ہاں، تم کس چکّر میں پڑے ہو؟ جاؤ اپنا ہوم ورک کرو"۔

جب بھی میں کسی مُعاملے میں ضرورت سے زیادہ دل

چسپی لینے لگتا ہوں' وہ مجھ سے یہی کہتے ہیں۔

بہرحال' لگتا تھا کہ اِسٹاکٹن اب دھر لیا جائے گا۔ ہو سکتا ہے ہیروں کے جوہری نے کسی وجہ سے اُس کی مُخبری کردی ہو۔

وہ جس گلی میں داخل ہُوا تھا' وہ آگے جاکر بند ہو جاتی تھی اور وہ واپس نہیں آیا تھا۔ ایک عمارت کا دروازہ کھُلا تھا۔ وہ ضرور اُس کے اندر داخل ہُوا ہوگا۔ پولیس کے سپاہی اُس کے دروازے پر پہرا دینے لگے تھے۔ عمارت کی چھت پر بھی دو پولیس والے پہنچ گئے تھے۔

ابھی میرے ذہن میں یہ خیال آیا ہی تھا کہ یہ ابّو کا کیس ہے کہ اچانک ایک اور پولیس کار آکر رُکی اور اُس میں سے ابّو باہر نکلے۔ اُن کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ وہیں رُک گئے "لیری! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" اُنھوں نے ڈانٹ کر کہا۔

"میں گھر جا رہا تھا کہ اِسٹاکٹن مجھ سے ٹکراتا ہُوا اِس بند گلی میں گھُس گیا" میں نے جواب دیا۔

"اچھا' تم گھر چلو" اُنھوں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا "مُجرم گولی بھی چلا سکتا ہے"۔ میں نے اپنی راہ لی' لیکن پھر رُک گیا' کیوں کہ میں کچھ سوچنا چاہتا تھا۔

نیو یارک شہر میں اپنے گھر کا دروازہ کوئی کھُلا نہیں رکھتا۔ اگر وہ دروازہ کھُلا تھا تو اِسٹاکٹن نے اُسے خود کھولا ہوگا۔ اِس کا مطلب ہے کہ اُس کے پاس اُس دروازے کی چابی ہوگی۔ وہ اِتنی جلدی تالا تو نہیں توڑ سکتا تھا۔ گویا وہ اس عمارت سے بخوبی واقف ہے۔

میں نے اُس عمارت پر نظر ڈالی۔ وہ ایک پُرانی چار منزلہ عمارت تھی۔ اُس میں چند ایک دُکانیں تھیں اور شام کی مدّھم روشنی میں اُن کے سائن بورڈ نظر آ رہے تھے۔

دوسری منزل کی دُکان پر بورڈ لگا تھا "کلِن اینڈ لیوی ٹیلرز" یہ درزی کی دُکان تھی۔ اُس سے اُوپر کی منزل پر تھیٹر کے ڈراموں میں اِستعمال ہونے والے کپڑوں کی دُکان تھی اور سب سے اُوپر کی منزل پر جوہری کی دُکان۔ جوہری کی دکان سے کچھ مسئلہ حل ہوتا نظر آتا تھا۔

اگر اِسٹاکٹن کے پاس عمارت کی چابی تھی تو وہ ضرور جوہری سے مِل کر یہ کام کرتا ہوگا۔ ابّو بھی یہ بات جانتے ہوں گے۔

میں گولی چلنے کے خیال سے ڈر رہا تھا۔ اگر گولی چلی تو کہیں ابّو زخمی نہ ہو جائیں۔ مگر گولی نہیں چلی۔ ہو سکتا ہے اِسٹاکٹن چاروں طرف سے پولیس کا گھیرا دیکھ کر ہتھیار پھینک دے اور اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کردے۔ مجھے کم از کم یہی اُمید تھی۔ میرا خیال تھا کہ پولیس کو عمارت خالی کرانے کی ضرورت نہیں پڑے گی کیوں کہ یہ اِتوار کی شام تھی اور اِتوار کو چھُٹّی ہوتی ہے۔ دُکانیں تقریباً خالی ہوں گی۔

تھوڑی دیر میں اِنتظار کرتا رہا۔ آخر تھک کر' چُپکے سے' پولیس کی نظر بچا کر عمارت میں داخل ہوگیا۔ ابّو نے عمارت کے اندر مجھے دیکھ لیا تو غصّے سے پاگل ہو جائیں گے' لیکن مُجھ سے رہا نہ گیا۔ میرا اندازہ تھا کہ اُنھوں نے اِسٹاکٹن کو اب تک گرفتار کرلیا ہوگا۔ میں اُسے دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اُنھیں ابھی تک وہ مِلا ہی نہ تھا۔

کچھ پولیس افسر زینے کے راستے اور کچھ لفٹ سے نیچے آ رہے تھے اور سب کے سب مایُوسی سے سر ہلا رہے تھے۔

ابّو سخت غصّے میں تھے "کچھ پتا نہیں چلا؟" اُنھوں نے پُوچھا۔

ایک پولیس سارجنٹ نے آگے بڑھ کر جواب دیا "سر' ڈونووان نے بتایا ہے کہ چھت پر کوئی نہیں آیا۔ تمام کھڑکیوں اور دروازوں پر پولیس پہرا دے رہی ہے"۔

"اگر وہ باہر نہیں گیا" ابّو نے یقین بھری آواز میں کہا "تو ضرور' عمارت کے اندر ہی موجود ہے"۔

"وہ اندر نہیں مِلا' سر" سارجنٹ نے کہا "وہ اندر کہیں بھی نہیں ہے"۔

ابّو نے کہا "یہ اِتنی بڑی بلڈنگ تو نہیں ہے کہ"

"ہم نے چوکیدار سے چابیاں لے کر تمام عمارت کو کھنگال ڈالا ہے' سر"۔

"اچھا" یہ ہمیں کیسے پتا چلا تھا کہ وہ اِس عمارت کے اندر داخل ہُوا ہے؟ اُسے اندر داخل ہوتے ہوئے کس نے دیکھا تھا؟" ابوّ نے پوچھا۔

پولیس کے کئی آدمی برآمدے میں موجود تھے لیکن سب کو جیسے چُپ سی لگ گئی۔ چناں چہ مجھے بولنا پڑا "میں نے دیکھا تھا، ابوّ"۔

ابوّ ایڑیوں کے بَل گھوم گئے۔ اور جب مجھے دیکھا تو اُن کے حلق سے ایک عجیب و غریب سی آواز نکلی جس کا مطلب تھا کہ وہ مجھے گھر جاکر سمجھیں گے۔ لیکن اُس وقت اُنھوں نے صِرف اِتنا کہا "یہ تم نے کہا تھا کہ وہ بند گلی کی طرف گیا ہے۔ اب کہ رہے ہو کہ تم نے اُسے عمارت کے اندر داخل ہوتے دیکھا ہے"۔

"ابوّ، وہ باہر نہیں آیا نا۔ اور اندر جانے کے عِلاوہ اور کوئی راستہ بھی تو نہیں"۔

لیکن ابوّ میری بات سُنی اَن سُنی کر کے پولیس والوں سے کہنے لگے "کیا کسی نے سچ مُچ اُسے عمارت کے اندر داخل ہوتے دیکھا ہے؟"

کسی نے کوئی جواب نہ دیا اور میں نے محسوس کیا کہ ابوّ اب اِس چھاپے کو ختم کرنے کا اِعلان کرنے والے ہیں۔ پھر وہ اور میں گھر پہنچیں گے، اور پھر میری شامت آئے گی۔ بس اللہ دے اور بندہ لے!

شاید "شامت" کے خیال نے میرے ذہن کو ضرورت سے زیادہ تیز کر دیا تھا۔ میں نے عمارت کے دروازے کو غور سے دیکھا اور پھر چلّا کر کہا "وہ رہا! وہ آدمی! اُدھر!" میں نے ایک شخص کی جانب اِشارہ کیا جو پولیس کی وردی پہنے ہُوئے تھا۔

اُس شخص نے گولی نہیں چلائی۔ جس وقت میں نے اِشارہ کیا تو وہ دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا اور باہر نکلنے والا تھا۔ میری آواز پر اُس نے ایک دم چھلانگ لگا دی۔ لیکن ایک پولیس والے نے اُسے جا دبوچا۔ بعد میں جوہری

کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔

اِسٹا کٹن کی گرفتاری کے بعد میں گھر چلا گیا اور جب ابّو گھر آئے تو اُنھوں نے مجھے نصیحت کی کہ مجھے اپنی جان خطرے میں نہیں ڈالنا چاہیئے۔ لیکن یہ بھی کہا "لیری' بہرحال' تمھیں تھیٹر کے کپڑوں کی دُکان کا خیال خوب سُوجھا"۔

میں نے کہا "جی ہاں' مجھے پُورا یقین تھا کہ وہ اُس عِمارت کے اندر داخل ہُوا ہے اور اِس بات کا بھی یقین تھا کہ وہ اُس عمارت سے بخوبی واقف ہے۔ جب پولیس آئی تو وہ سیدھا تھیٹر کے کپڑوں کی دُکان میں گھُس گیا۔ اُس دُکان میں وہ کپڑے فروخت ہوتے ہیں جو ڈراموں میں ایکٹر اِستعمال کرتے ہیں۔ اور اُن میں پولیس کی وردیاں بھی تھیں۔ اِسٹا کٹن نے پولیس کی وردی پہن لی تو پولیس والے اُسے بھی پولیس کا سپاہی سمجھیں گے اور وہ اِطمینان سے نکل جائے گا"۔

" لیکن لیری بیٹے' امّی بولیں "تمھیں یہ کیسے پتا چلا کہ کون سا پولیس والا اِسٹا کٹن ہے؟ تم نہ تو اِسٹا کٹن کو جانتے تھے اور نہ سارے پولیس والوں کو"۔

"مجھے یہ جاننے کی ضرورت بھی کیا تھی' امّی؟" میں نے کہا "مجھے یہ پتا تھا کہ جلدی میں جو وردی بھی ہاتھ لگے گی' وہ پہن لے گا۔ سائز کا خیال نہیں کرے گا۔ اِس لیے میں نے ایسے پولیس والے کو تلاش کیا جس کی وردی اُس کے جسم پر فِٹ نہیں ہو۔ چُناں چہ جب میں نے دیکھا کہ ایک پولیس والے کی پینٹ بہُت چھوٹی ہے اور اُس کے ٹخنے تک نظر آرہے ہیں تو فوراً جان گیا کہ وہی اِسٹا کٹن ہے!"

روشنی کیا ہے؟

روشنی کے بغیر ہم کوئی چیز نہیں دیکھ سکتے۔ پھر بھی ہم نہیں جانتے کہ روشنی کیا ہے۔ ہمیں صِرف یہ معلوم ہے کہ روشنی ایک قسم کی طاقت ہے' اُس کی رفتار کو ناپا جا سکتا ہے اور یہ کہ سفید روشنی کئی رنگوں کا مجموعہ ہے۔

رنگ روشنی سے بنتے ہیں۔ سبز کاغذ اِس لیے سبز نظر آتا ہے کہ یہ سبز رنگ کے سِوا روشنی میں موجود باقی تمام رنگوں کو جذب کرلیتا ہے اور ہمیں صرف سبز رنگ ہی دکھائی دیتا ہے۔ اِسی طرح نیلا شیشہ اِس لیے نیلا نظر آتا ہے کہ یہ نیلے کے سِوا باقی تمام رنگوں کو اپنے اندر جذب کرلیتا ہے۔

سیاہ رنگ کی چیزیں روشنی اور حرارت کو جذب کرتی ہیں۔ سفید رنگ کی چیزیں روشنی اور حرارت کو جذب نہیں کرتیں۔ اِسی لیے سفید کپڑے سیاہ کپڑوں کی نِسبت ٹھنڈے ہوتے ہیں (گرمیوں میں سفید کپڑے پہننا چاہئیں)۔

سب سے پہلے ایک انگریز سائنس دان' آئزک نیوٹن' نے معلوم کیا کہ روشنی کیا ہے۔ اُس کے خیال کے مُطابق روشنی کے بہُت باریک باریک ذرّے ہوتے ہیں' جو روشنی کے مرکز سے چاروں طرف پھیل جاتے ہیں۔ اِس کے بعد ایک دُوسرے سائنس دان ہیگنز نے روشنی کی لہریں دریافت کیں۔ اُس کا خیال تھا کہ پانی کی لہروں کی طرح روشنی کی بھی لہریں ہوتی ہیں جو اپنے مرکز سے باہر کی طرف چلتی ہیں۔

یہ بحث ڈیڑھ سو سال سے جاری ہے کہ اِن میں سے کس کا خیال صحیح ہے۔ ابھی تک روشنی کے مُتعلّق کوئی تسلّی بخش جواب نہیں ملا ہے۔ تجربے جاری ہیں۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ روشنی ذرّوں کی صورت میں بھی پھیلتی ہے اور لہروں کی صورت میں بھی۔

روشنی کی رفتار 186,000 میل فی سیکنڈ ہے۔ زمین تک سورج کی روشنی 8-1/2 منٹ میں پہنچتی ہے۔

(س-ل)

یومِ پاکستان

(23 مارچ 1940ء)

Sharjeel Ahmed

23 مارچ کا دِن تھا پیارا — قومی اُمنگوں نے یہ سنوارا
مُسلم لیگ کا رنگ جما تھا — سارا منٹوپارک سجا تھا
قائدِاعظمؒ جان ہماری — آن ہماری، شان ہماری
ہم کو بتایا پیار سے رہنا
اپنا مقصد پاکے رہنا

پاکستان کا خواب سُنایا — قوم کو اپنے ساتھ لگایا
ایک تھا نعرہ، ایک لگن تھی — سب کی تمنّا ایک وطن تھی
ہم نے اِس کی خاطر ہر دم — جانیں دِیں اور جھیلے غم
قائدِاعظمؒ نے یہ بنایا — پاکستان کا رنگ سجایا
پاکستان سے پیار کریں ہم
آؤ، یہ اِقرار کریں ہم

فرحت شاہ جہان پوری

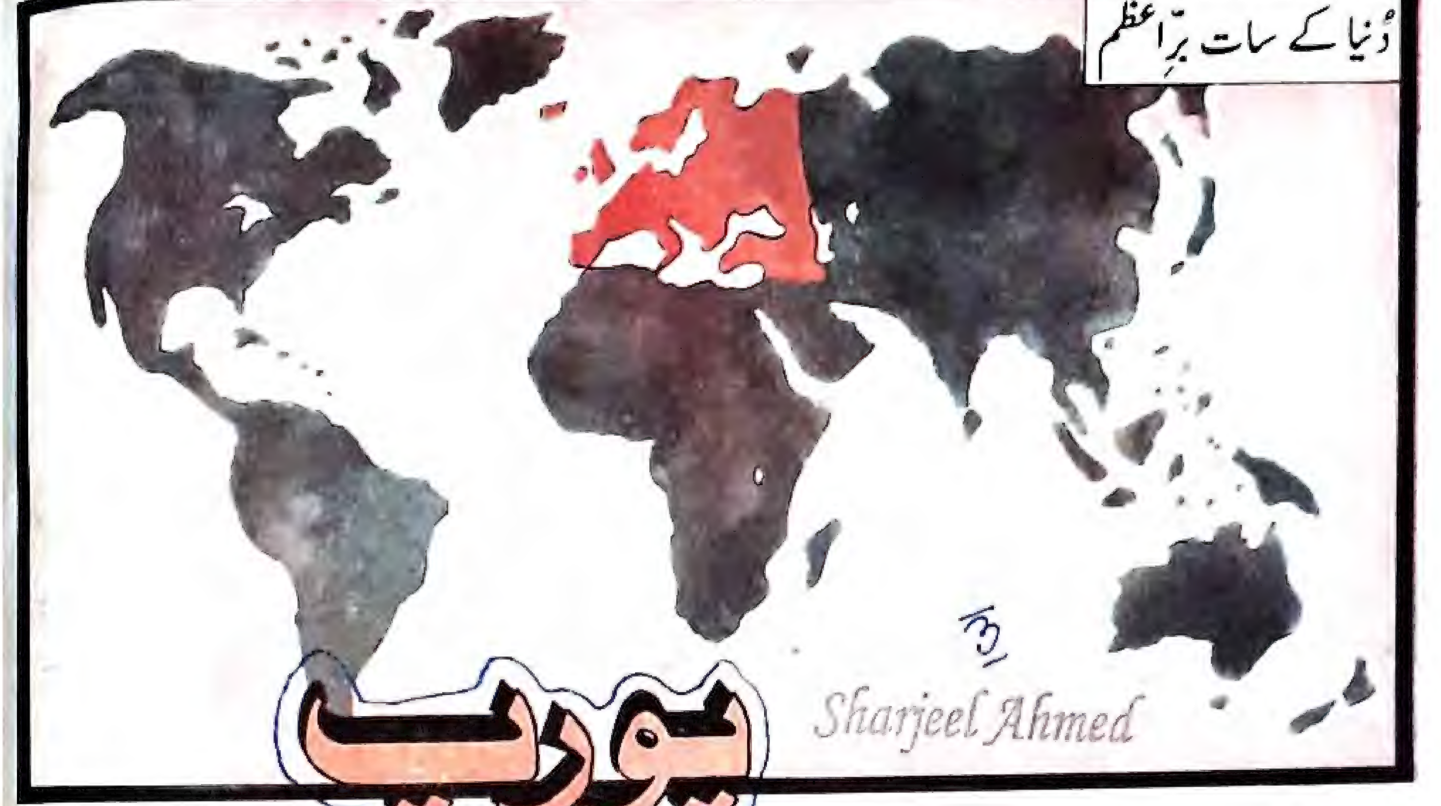

یورپ

یورپ دُنیا کا دُوسرا سب سے چھوٹا برِاعظم ہے۔ (پہلا سب سے چھوٹا برِاعظم آسٹریلیشیا ہے) لیکن یہ برِاعظم، شمالی امریکا کے سوا، باقی تمام برِاعظموں سے بہُت زیادہ ترقّی یافتہ اور خوش حال ہے۔ اِس وقت ہم دُنیا میں جو علمی اور سائنسی ترقّی دیکھ رہے ہیں، اِس میں یورپ کا بہُت بڑا حصّہ ہے۔ یہ برِاعظم دراصل اُسی خِطّۂ زمین کا حصّہ ہے جس میں برِاعظم ایشیا ہے۔ لیکن اِسے ایک علیٰحدہ برِاعظم ہی کہا جاتا ہے۔ اِسے، مشرق میں یورال کے پہاڑ اور بُحیرۂ کیسپین ایشیا سے جُدا کرتے ہیں۔ جنوب مغرب میں، آب نائے جبلُ الطّارق کے مقام پر، اِس برِاعظم سے افریقہ کا برِاعظم صرف 14 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ آپ نقشہ دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ برِاعظم یورپ تین بڑے حِصّوں میں بٹا ہُوا ہے۔

(1) شمالی پہاڑ: یہ پہاڑ جزائرِ برطانیہ کے شمال سے گزرتے ہُوئے ناروے اور سویڈن کے ملکوں تک چلے گئے ہیں۔ مشرق میں یہ جنوب کی طرف مُڑ کر رُوس کی جانب چلے جاتے ہیں، اور یہاں یورال پہاڑ کہلاتے ہیں۔ ناروے کے ساحل پر سمندر نے اِن پہاڑوں کے درمیان خوب صورت کھاڑیاں بنا دی ہیں۔

(2) وسطی پہاڑ: اِن پہاڑوں نے برِاعظم یورپ کے اکثر حصّے کو گھیرا ہُوا ہے۔ یہ مغرب میں آئرلینڈ سے لے کر مشرق میں روس تک پھیلے ہوئے ہیں۔ کسی زمانے میں یہ گھنے جنگلوں سے ڈھکے ہوئے تھے، لیکن اب یہاں (سوائے شمالی اور وسطی علاقے کے) چند ہی جنگل رہ گئے ہیں۔ یورپ کی بہترین زرعی زمینیں اِسی حصّے میں ہیں، اور زیادہ تر شہر اور دیہات بھی یہیں آباد ہیں۔

(3) جنوبی پہاڑ: اِن میں کئی پہاڑی سِلسِلے شامل ہیں۔ مغرب میں پائرنیز کے پہاڑ اِسپین اور فرانس کے درمیان سینہ تانے کھڑے ہیں۔ ایلپس کے پہاڑ جنوب مشرقی فرانس سے شروع ہوکر سوئٹزر لینڈ، آسٹریا اور شمالی اِٹلی سے گزرتے ہوئے یوگوسلاویہ تک چلے گئے ہیں۔ اِن کی سب سے اُونچی چوٹی مونٹ بلانک ہے۔ یہ چوٹی فرانس اور اِٹلی کی سرحد پر ہے، اور 4810 میٹر بلند ہے۔ ایلپس کی اُونچی

اُونچی ڈھلانیں ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ مشرق کی جانب، بحیرۂ اسود اور بحیرۂ کیسپین کے درمیان، کاکیشیا (قفقاز) کے پہاڑ ہیں۔ کاکیشیا کا کوہ البرس جو 5633 میٹر بلند ہے، یورپ کا سب سے اُونچا پہاڑ ہے۔

جھیلیں اور دریا: بحیرۂ کیسپین جو یورپ کے جنوب مشرق میں ہے، دراصل ایک جھیل ہے، کیوں کہ یہ چاروں طرف خشکی سے گھری ہوئی ہے۔ یہ دُنیا کی سب سے بڑی جھیل ہے۔ اِس کا پانی نمکین ہے۔

یورپ کے بڑے دریاؤں میں مُسافر اور سامان ڈھونے والی موٹر کشتیاں چلتی ہیں۔ اِس برِّاعظم کا سب سے لمبا دریا وولگا ہے، جو جنوب کی طرف 3742 میل تک بہتا ہے اور رُوس سے گزرتا ہوا بحیرۂ کیسپین میں جاگرتا ہے۔ دوسرے اہم دریا ڈین یوب اور رائن ہیں۔

دریائے ڈینیوب مشرق کی طرف بہتا ہے اور وسطی یورپ سے گزر کر بحیرۂ اسود میں گر جاتا ہے۔ دریائے رائن شمال کی جانب بہتا ہوا شمالی سمندر میں گرتا ہے۔

آب و ہوا: بحرِ اوقیانوس کی جانب سے چلنے والی مغربی ہوائیں برِّاعظم یورپ کے زیادہ تر حصّے کو موسمِ سرما میں گرم اور موسمِ گرما میں ٹھنڈا رکھتی ہیں۔ جنوب میں، بحیرۂ رُوم کے ساحلوں پر آباد ملکوں میں موسمِ گرما گرم خشک ہوتا ہے۔ برِّاعظم کے بعض شمالی اور مشرقی حصّے گرمیوں میں گرم ہوتے ہیں لیکن سردیوں میں یہاں سخت سردی پڑتی ہے۔ برِّاعظم کا اِنتہائی شمالی حصہ قُطبِ شمالی کے برفیلے میدانوں میں واقع ہے۔ یہاں کی آب و ہوا اِنتہائی سرد ہے۔

نباتات اور حیوانات: یورپ کے بچے کُھچے جنگلوں میں زیادہ تر صنوبر کے درخت اُگتے ہیں۔ بحیرۂ رُوم کے اکثر حصّوں میں زیتون اور پام کے درخت پائے جاتے ہیں۔ اِس برِّاعظم میں بڑے ممیل (دُودھ پلانے والے جانور) اب بہُت کم رہ گئے ہیں۔ اِس کی وجہ اندھا دُھند شکار اور جنگلوں کی کٹائی ہے۔ بہرحال، تھوڑے بہُت ریچھ، بھیڑیے، سُؤر اور ہرن اب بھی موجود ہیں۔ اِن کے عِلاوہ گِلہریاں، اُود بِلاؤ (بیجر)، خرگوش اور قسم قسم کے پرندے پائے جاتے ہیں۔

یورپ کے لوگ : تمام برّاعظموں میں صِرف ایشیا ایسا برِّاعظم ہے جس کی آبادی یورپ سے زیادہ ہے۔ لیکن ایشیا کا رقبہ بہُت زیادہ اور یورپ کا بہُت کم اور گنجان ہے۔ یہاں کے لوگ عموماً بہُت سُرخ و سفید، محنتی اور ذہین ہوتے ہیں۔ اِنہوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں بہُت ترقی کی ہے۔ ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکا کے اکثر ملک صدیوں تک اِن کے غُلام رہے ہیں۔ برّاعظم یورپ کی آبادی 62 کروڑ کے لگ بھگ ہے، اور اکثر باشندے کا کیشی نسل کے (گورے چٹّے) ہیں۔

زبانیں : برّاعظم یورپ میں تقریباً 60 مُختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اِن میں انگریزی، فرانسیسی، جرمن، رُوسی اور ہسپانوی بہُت ترقّی یافتہ زبانیں ہیں۔ انگریزی بینَ الاقوامی زبان ہے، اور تقریباً تمام دُنیا میں پڑھی اور سمجھی جاتی ہے۔

زراعت : یورپی کسانوں کے کھیت چھوٹے ہوتے ہیں، لیکن جدید مشینری اور عُمدہ کھاد کی وجہ سے یہاں فی ایکڑ پیداوار ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکا سے بہُت زیادہ ہے۔ گیہوں اور جو اِس برّاعظم کی خاص اَجناس ہیں۔ دوسری اہم فصلیں آلو، چُقندر (جس سے چینی بنائی جاتی ہے)، پھل اور سبزیاں ہیں۔ اکثر کسان گایوں اور بھیڑوں کے ریوڑ بھی پالتے ہیں، جن سے گوشت، اُون، دُودھ اور دُودھ سے بننے والی اشیا حاصِل کی جاتی ہیں۔

معدنیات : یورپ کے بعض حصّے قیمتی معدنیات مثلاً پٹرولیم، سونا، کوئلا، لوہا وغیرہ سے مالا مال ہیں۔

صنعتیں : مغربی یورپ کے مُلک (برطانیہ، فرانس، جرمنی، اِٹلی، سُویڈن اور نیدرلینڈز) صنعتی اِعتبار سے بہُت ترقّی یافتہ ہیں۔ یہاں مشینری، کیمیکلز، کپڑے، بحری و ہوائی جہاز، موٹر کاریں اور روزمرّہ زندگی میں اِستعمال ہونے والی اشیا کے بڑے بڑے کارخانے ہیں۔ سوئٹزرلینڈ کی گھڑیاں دُنیا بھر میں مشہور ہیں۔

تاریخ : دُنیا کی قدیم تہذیبوں میں سے دو تہذیبوں (یُونانی اور رومن) نے اِس برّاعظم میں جنم لیا۔ اِس کے بعد یہاں مسیحی (عیسائی) سلطنتیں قائم ہوگئیں۔ آج سے 200 سال پہلے، اٹھارہویں صدی میں، اِس برّاعظم کے کئی مُلکوں نے ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکا کے ملک فتح کر کے یہاں اپنی حکومتیں قائم کیں۔ دُوسری جنگِ عظیم (جو 1939ء سے 1945ء تک لڑی گئی) کے بعد یہ سبُ ملک ایک ایک کر کے آزاد ہوگئے۔ (س۔ل)

یورپ کے بچّے

Sharjeel Ahmed

آئیے مُسکرائیے

ایک لڑکا کمرۂ اِمتحان میں آگے بیٹھے ہوئے لڑکے کے پرچے سے اُچک اُچک کر نقل کر رہا تھا۔ نگران نے اُس سے کہا "اگر آپ کہیں تو میں آپ کو اِس کے پاس بٹھا دُوں؟"

"جی، شکریہ" لڑکے نے جواب دیا "مجھے یہیں سے صاف نظر آ رہا ہے"۔ (خواجہ شہزاد صادق بٹ، راولپنڈی)

ماسٹر صاحِب نے بچّوں کو خاموشی کے فائدے بتائے اور پھر اُن سے پُوچھا "جو شخص مُسلسل بولتا ہو اور کسی دُوسرے کو بولنے کا موقع نہ دے، اُسے ہم کیا کہیں گے؟"

پچھلے کونے سے آواز آئی "ماسٹر صاحِب"۔

(محمّد سعید رضا، بورے والا)

ایک عورت نے بھکاری کو رُوکھی سُوکھی روٹیاں دیں۔ بھکاری روٹیاں لے کر کھڑا رہا۔ عورت نے کہا "روٹیاں تو دے دیں۔ اب کیوں کھڑے ہو؟"

بھکاری بولا "ہاضمے کی گولیاں بھی دے دیں"

(عارِفہ ہُدیٰ خان، رحیم یار خان)

نہروں کے محکمے کا ایک افسر گشت کر رہا تھا کہ نہر میں ایک آدمی کو دیکھ کر رُک گیا۔ اُس نے چیخ کر اُس سے کہا "سُنو! نہر میں تیرنے کی اِجازت نہیں ہے"۔

آدمی نے ہاتھ پاؤں مارتے ہُوئے کہا "تیر کہاں رہا ہُوں، میں تو ڈُوب رہا ہُوں"۔

"پھر ٹھیک ہے" افسر نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

(محمّد اِسماعیل سرسانہ، نیو ملتان)

ایک آدمی اپنے گدھے کو نہلا رہا تھا۔ اُس کے ہمسائے نے پُوچھا "ارے بھئی، اِسے کِس خوشی میں نہلا رہے ہو؟"

آدمی نے کہا "آج اِس کی شادی ہے"۔

ہمسایہ بولا "اِس خوشی میں ہمیں کیا کِھلاؤ گے؟"

"جو دُولھا کھائے گا وہ تم بھی کھا لینا" آدمی نے جواب دیا۔ (محمّد یاسِر جاوید، اِسلام آباد)

ایک بہُت دولت مند مگر بے حد کنجُوس خاتون کہیں جا رہی تھیں کہ راستے میں اُن کے فیملی ڈاکٹر مِل گئے۔ خاتون کو کھانسی کی شکایت تھی۔ اُنھوں نے سوچا کہ کیوں نہ موقع سے فائدہ اُٹھایا جائے اور فیس دیے بغیر ڈاکٹر سے دوا معلوم کر لی جائے۔

وہ ڈاکٹر سے پُوچھنے لگیں "معاف کیجیے، ڈاکٹر صاحِب، آپ کو کھانسی کی شکایت ہوتی ہے تو آپ کیا کرتے ہیں؟"

ڈاکٹر نے کچھ سوچا اور پھر بولا "کرتا کیا ہُوں، بس کھانستا رہتا ہُوں" (مناجل آصف، جہلم شہر)

اُستاد (شاگرد سے): بھائی چارہ کو جُملے میں اِستعمال کرو۔

شاگرد: اکرم نے جب دُودھ والے سے پُوچھا کہ بھائی، دُودھ اِتنا مہنگا کیوں کر دیا ہے تو وہ بولا، بھائی چارہ جو مہنگا ہو گیا ہے۔ (سیّدہ حِرا فاطِمہ، اِسلام آباد)

باپ (بیٹے سے): یہ آپ کمرے کی دیواروں پر پنسل سے لکیریں کیوں کھینچ رہے ہیں؟ اِس طرح تو دیواریں خراب ہو جائیں گی۔

بیٹا: لیکن ابّا جان، پہلے تو آپ نے مُجھے کبھی منع نہیں کیا۔

باپ: بیٹے، پہلے کی بات اور تھی۔ اُس وقت ہم کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ یہ تو ہمارا اپنا مکان ہے۔ ہر شخص کو اپنی چیز کا خیال رکھنا چاہیے۔

(افشاں سالار، لانڈھی نمبر 1 کراچی)

آپ جانتے ہیں؟

○ انگریزی میں دہی کو CURD کہتے ہیں۔ لیکن بازار میں پلاسٹک کے گلاس میں جو دہی ملتا ہے، اُس پر یوگرٹ (YOGHURT) لکھا ہوتا ہے۔ کیوں؟

اصل میں یوگرٹ خاص قِسم کا دہی ہوتا ہے جو تُرکی میں بنایا جاتا ہے۔ تُرک دُودھ میں چینی اور پھلوں کے ٹکڑے ملا کر اُسے جماتے ہیں اور اُسے "یوغرت" کہتے ہیں۔ یوگرٹ اِسی یوغرت کی بگڑی ہُوئی شکل ہے۔

○ پریشر کُکر ایک فرانسیسی مِستری، ڈینس یوجن نے، آج سے تین سو سال پہلے بنایا تھا۔ یہ ایک لمبا سا سلنڈر تھا جس کے مُنہ پر ڈھکنا لگا ہُوا تھا۔ اِس کے اندر پانی اُبلتا تھا اور بھاپ کے دباؤ سے کھانا منٹوں میں پک جاتا تھا۔

○ اِلرجی بیماری نہیں، بلکہ اُن چیزوں کے خِلاف ہمارے جِسم کا ردِ عمل ہے جنہیں وہ قبول نہیں کرتا۔ اِن چیزوں میں بعض غذائیں (مچھلی، انڈا وغیرہ) زیرۂ گُل (POLLEN) اور گرد و غبار وغیرہ شامل ہیں۔ بعض حالتوں میں کسی چیز کی شکل بدل دی جائے تو اُس سے اِلرجی نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر کسی کو دودھ سے اِلرجی ہو تو اُسے دودھ کی کھیر یا کوئی اور پُڈنگ بنا کر کھلائیں۔ وہ اُس سے اِلرجک نہیں ہو گا۔

○ بعض لوگ سوتے میں خرّاٹے کیوں لیتے ہیں؟

اصل میں ایسے لوگوں کے حلق میں بیک وقت ناک اور مُنہ کے راستے ہوائیں داخل ہوتی ہیں۔ اِنہی ہواؤں کے آپس میں ٹکرانے سے ڈراؤنی آوازیں پیدا ہوتی ہیں، جنہیں خرّاٹے کہتے ہیں۔

○ کیا ہاتھی سچ مُچ سو سال تک زندہ رہتا ہے؟

سب ہاتھی نہیں، بعض ہاتھی سو سال تک زندہ رہتے ہیں۔ ویسے عام ہاتھی کی عُمر 60 سے 70 سال ہوتی ہے۔ جانوروں میں ہاتھی سے زیادہ عُمر پانے والا جانور کچھوا ہے۔ بعض کچھوے 150 سال سے بھی زیادہ مُدّت تک جیتے ہیں۔

○ جب ہمارے جِسم میں آکسیجن کی کمی ہو جاتی ہے تو ہمارا دماغ ہمارے مُنہ کو حکم دیتا ہے کہ آکسیجن لاؤ۔ اِس پر ہم مُنہ پھیلا کر زور سے سانس لیتے ہیں، جس سے ڈھیروں آکسیجن ہمارے پھیپھڑوں میں چلی جاتی ہے۔ اِسے جماہی کہتے ہیں۔ تنگ اور گھُٹی ہوئی جگہ جمائیاں بہت آتی ہیں۔ اِس صورت میں فوراً باہر کھُلی ہوا میں چلے جانا چاہیئے۔ ورنہ آپ جتنی دیر بھی وہاں بیٹھیں گے، مُنہ پھاڑ پھاڑ کر جمائیاں لیتے رہیں گے۔

جماہی یا جمائی ہم ہی نہیں لیتے، جانور بھی لیتے ہیں۔ جماہی آئے تو اُسے روکیں نہیں۔ البتّہ مُنہ پر ہاتھ رکھ لیں۔ دُوسروں کے سامنے مُنہ پھاڑنا بدتمیزی ہے۔

○ حضرت نُوحؑ کی کشتی کتنی بڑی تھی کہ انُھوں نے اُس میں دُنیا کے تمام جانوروں کا ایک ایک جوڑا رکھ لیا تھا؟

بائبل کی کتاب پیدائش میں لکھا ہے کہ حضرت نُوح علیہِ السّلام کی کشتی تین سو ہاتھ (Cubit) لمبی، پچاس ہاتھ چوڑی اور تیس ہاتھ اُونچی تھی۔ پُرانے زمانے میں چیزوں کی لمبائی، چوڑائی اور اُونچائی ہاتھوں سے ناپتے تھے۔ جوان آدمی کا ہاتھ (یا یُوں کہیئے کہ بازُو کا اگلا حِصّہ) کہُنی سے بڑی اُنگلی تک تقریباً سترہ اِنچ لمبا ہوتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہُوا کہ حضرت نُوحؑ کی کشتی 425 فٹ لمبی، 71 فٹ چوڑی اور 1/2-42 فٹ اُونچی تھی۔

○ اُردُو اخباروں میں لکھا ہوتا ہے کہ فلاں شخص رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ اِس کا کیا مطلب ہے؟

اِس کا مطلب ہے کہ وہ شخص یا مُجرِم عین موقع پر جُرم کرتا ہُوا پکڑا گیا۔ یہ دراصل انگریزی کے RED-HANDED کا ترجمہ ہے۔ پہلے یہ ترکیب یا مُرکّب لفظ قاتلوں کے لیے اِستعمال ہوتا تھا جن کے ہاتھ خون سے رنگے ہوتے تھے۔ بعد میں عام مُجرِموں کے لیے اِستعمال ہونے لگا۔

○ عید کارڈ کس نے اِیجاد کیا تھا؟

عید کارڈ کا تو پتا نہیں (کیوں کہ ہم ایسے ریکارڈ نہیں رکھتے) البتّہ دُنیا کا پہلا کرسمس کارڈ ایک انگریز آرٹسٹ جان ہارسلے، نے 1843ء میں بنایا تھا۔

Sharjeel Ahmed

ہیرا اور پتھر

سیّد اِشتیاق الحسن

برسوں پُرانی بات ہے، کسی مُلک پر ایک راجا حکومت کرتا تھا۔ راجا کی راجاؤں جیسی باتیں تھیں۔ سیر و شکار، تفریح اور عیش و آرام۔ ایک بار وہ امیروں اور وزیروں کے ساتھ شکار کے لیے جنگل میں نکل گیا۔ اچھا خاصا لاؤ لشکر ساتھ تھا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ سورج پُوری آب و تاب کے ساتھ اُن کے سروں پر چمک رہا تھا۔ زمین بُری طرح تپ رہی تھی۔ لُو کے جھکڑ جسموں کو جھلسائے دے رہے تھے۔

راجا کو شکار کھیلتے کھیلتے سخت پیاس لگی۔ اِتّفاق کی بات کہ اُس کے پاس پانی کا جو ذخیرہ تھا، وہ بالکل ختم ہوگیا تھا۔ نوکر چاکر پانی کی تلاش میں چاروں طرف گھوم پھر رہے تھے مگر نہ کہیں آس پاس کوئی کنُواں تھا اور نہ کوئی چشمہ یا تالاب۔ بڑی مشکل میں جان پھنس گئی تھی۔ مارے پیاس کے راجا کا گلا خُشک ہوگیا اور زبان میں کانٹے پڑ گئے۔ مگر پانی تھا کہ ملنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔

آخر راجا نے مجبُور ہو کر حکم دیا کہ پانی نہیں مِل رہا ہے تو کہیں سے رس بھرے پھل ہی لے آؤ تاکہ اُنہیں چُوس کر پیاس بُجھائی جا سکے۔ نوکروں کو کافی تلاش کے بعد انار کے چند درخت نظر آئے۔ اُنھوں نے سوچا، اِس وقت اِس سے بہتر اور کون سا پھل ہو سکتا ہے۔ چلو کچھ انار توڑ کر راجا کی خدمت میں پیش کر دیتے ہیں۔ مگر مشکل یہ تھی کہ انار کافی اُونچائی پر لگے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے اِینٹ اور پتّھر مار کر توڑنے کی کوشش کی تو ایک بے ہنگم سا قہقہہ سُنائی دیا، جیسے وہ کوئی بے وقوفی کی بات کر رہے ہوں اور اُن کی اِس حماقت پر کوئی دل کھول کر ہنس رہا ہو۔

راجا نے غور سے اِدھر اُدھر دیکھا تو اُسے کچھ فاصلے پر ایک اندھا بُوڑھا نظر آیا جو بُری طرح ہنس رہا تھا۔ راجا کو اُس پر سخت غُصّہ آیا۔ اُس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ بے ادب بوڑھے کو گرفتار کر کے پیش کیا جائے۔ اِس نے ہماری شان میں گُستاخی کی ہے۔ حکم کی دیر تھی، بوڑھے کو گرفتار کر کے راجا کے حضُور پیش کر دیا گیا۔

بُوڑھا نہایت بے باکی سے بولا "حضُور، میں آپ کے نوکروں کی بے وقوفی پر ہنس رہا تھا۔ بھلا بتایئے تو، جنگل میں اچھے انار کیسے مِل جائیں گے؟ اُن اناروں کو طوطوں اور گلہریوں نے کہاں چھوڑا ہوگا؟ جو انار آپ کو نظر آ رہے ہیں، یہ سُوکھے اور گلے سڑے ہیں جنھیں پرندوں نے کھا کر

چھوڑ دیا ہے۔ آپ کا پیاس سے بُرا حال ہے۔ بجائے اِس کے کہ یہ لوگ آپ کو شہر لوٹ چلنے کا مشورہ دیتے یا کسی آس پاس کے گاؤں میں لے جاتے، آپ کا وقت برباد کر رہے ہیں۔ آپ خود سوچیں، کیا یہ بے وقوفی کی بات نہیں ہے؟ بھلا اِس حماقت پر کسے ہنسی نہیں آئے گی؟"

راجا کے دل کو بوڑھے کی بات لگ گئی۔ بات تھی بھی بڑے پتے کی۔ اُس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد بوڑھے کو اپنے ساتھ محل میں چلنے کے لیے کہا اور اُس کی عقل مندی سے خوش ہو کر اُسے ایک سیر مکئی روزانہ دیے جانے کا حکم دے دیا۔ راجا جب بھی کسی پریشانی یا اُلجھن میں گرفتار ہوتا تو بوڑھے کو طلب کرتا اور اُس سے مشورہ کرتا۔

ایک بار راجا کے دربار میں ایک جوہری آیا۔ اُس نے دو پتھر راجا کو پیش کیے جو چمک دمک اور خوب صورتی میں بے مثال تھے۔ دونوں کی تراش خراش، ساخت اور سائز بالکُل ایک سا تھا۔ اُس نے راجا سے کہا:

"حضُور، اِن میں ایک قیمتی ہیرا ہے اور دُوسرا ایک بے قیمت پتھر۔ اب اِس کی شناخت آپ پر رہی۔ لیجیے، آپ خود اصل ہیرے اور پتھر کو پہچانیں"۔

راجا اور اُس کے درباری اصلی ہیرے کو پہچاننے میں ناکام رہے تو راجا نے اُس بوڑھے کو بُلایا اور حکم دیا کہ وہ اصلی ہیرے کو شناخت کرے۔ اندھے نے تھوڑی دیر دونوں کو ہاتھوں سے ٹٹولا اور پھر اُن میں سے ایک اُٹھا کر راجا کی خدمت میں پیش کر دیا۔

"حضُور، یہ رہا اصلی ہیرا۔ اب آپ اِسے بے فکر ہو کر خرید لیں"۔

جوہری اندھے کی صحیح شناخت پر حیران رہ گیا اور مارے خوشی کے چِلّا اٹھا "حضُور، اِس نابینا کا اِنتخاب بِالکُل ٹھیک ہے"۔

راجا بڑا حیران تھا کہ آنکھوں والے جسے نہ پہچان سکے، ایک اندھے نے اِتنی جلدی پہچان لیا۔ وہ بولا "بڑے میاں، تم دیکھنے سے معذُور ہو۔ پھر کس طرح تم نے اصل ہیرے کو پہچان لیا؟"

بوڑھا مسکرا کر بولا "حضُور، یہ کون سی ایسی بڑی بات ہے۔ پتھر گرمی پا کر گرم ہو جاتا ہے اور ہِیرے پر گرمی کا اثر نہیں ہوتا۔ میں نے اُنہیں ذرا دیر دُھوپ میں رکھا اور پھر دونوں کی حرارت کا اندازہ کر کے حضُور کی خدمت میں

پیش کر دیا"۔

راجا بوڑھے کی عقل مندی پر بے حد خوش ہُوا۔ اُس نے حکم دیا کہ آج سے بوڑھے کو دونوں وقت بجائے ایک سیر مکئی کے دو سیر مکئی دی جائے۔

کچھ دِنوں کے بعد راجا نے پھر بوڑھے کو بُلایا اور کہا "بڑے میاں، تم نہایت عقل مند، سمجھ دار اور دانا ہو۔ میری ایک بات کا جواب دو۔ میں ایک عقل مند، نیک اور خاندانی راجا ہُوں یا نہیں؟"

بوڑھا بولا "نہیں۔ بالکل نہیں"۔

بوڑھے کی اِس جُرأت پر تمام درباری سکتے میں آ گئے۔ جیسے اُنہیں سانپ سُونگھ گیا ہو۔

راجا غُصّے سے بولا "تم نے یہ اندازہ کس طرح لگایا؟"

بوڑھا بولا "حضُور، آپ خاندانی راجا نہیں ہیں۔ آپ ایک غریب سپاہی کے بیٹے تھے۔ ترقّی کرتے کرتے فوج کے سپہ سالار ہوئے۔ ترقّی کرنا بڑی اچھی بات ہے۔ لیکن آپ نے اصلی راجا یعنی اپنے محُسن کو دھوکے سے قتل کر کے، اُس کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ اِحسان فراموشی نہایت ذلیل چیز ہے۔ چُوں کہ آپ نے اپنے محُسن کو دغا دی اِس لیے آپ نیک نہیں ہیں۔ آپ سمجھ دار اور عقل مند اِس وجہ سے نہیں ہیں کہ آپ نے میری قابلیّت کی قدر نہیں کی۔ آپ نے میری دانائی کا اِنعام صرف چند سیر مکئی کے دانوں سے دیا۔ اِس کا صِلہ تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ آپ مجھے اپنے خاص درباریوں میں شامل کرتے اور ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تاکہ آپ میرے مشوروں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھاتے۔ اب آپ خود ہی فیصلہ کیجیے جو آدمی کسی عقل مند اور ہوشیار آدمی سے پُورا پُورا فائدہ نہ اُٹھائے، وہ کس طرح عقل مند اور دانا کہلایا جا سکتا ہے"۔

راجا کی گردن شرم سے جُھک گئی۔ بوڑھا بڑے اِطمینان سے اُٹھا اور رُخصت ہو گیا۔

پانی کیا چیز ہے؟

پانی زمین، ہَوا اور ہر جان دار شے میں موجود ہے۔ پانی کے بغیر کوئی جان دار زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن یہ ہے کیا؟

پانی دو گیسوں، ہائیڈروجن اور آکسیجن، کا مُرکّب ہے۔ ہائیڈروجن گیس ہلکی ہوتی ہے اور آکسیجن بھاری۔ جب ہائیڈروجن آکسیجن سے مِل کر جلتی ہے تو پانی بن جاتا ہے۔

پانی تین حالتوں میں ملتا ہے۔ سیّال حالت میں (جو ہم ہر وقت اِستعمال کرتے ہیں)۔ دُوسرے برف کی صورت میں اور تیسرے گیس کی صورت میں، جسے ہم آبی بخارات کہتے ہیں۔

32 °F یا 0 °C میں پانی جم جاتا ہے۔ 212 °F یا 100 °C میں پانی آبی بخارات کی شکل اِختیار کر لیتا ہے۔ اِسی طرح برف کا ایک ٹکڑا کسی گرم جگہ پر رکھا جائے تو وہ پگھل کر پانی بن جائے گا اور اگر گرمی بہت زیادہ ہو تو بخارات بن کر اُڑ جائے گا۔

کوئلا کیسے بنتا ہے؟

کوئلا کانوں سے نکالا جاتا ہے۔ زمین کے اندر، کان میں، کوئلے کی میلوں لمبی تہیں ہوتی ہیں اور اُن کی موٹائی اکثر دس فُٹ تک ہوتی ہے۔ جب درخت اور پودے لاکھوں سال تک زمین کے اندر دبے رہیں تو زمین کی اندرُونی تبدیلیوں کی وجہ سے وہ کوئلا بن جاتے ہیں۔

کوئلا زمین میں آج سے 250,000,000 سال پہلے بننا شروع ہُوا اور یہ عمل تقریباً 35,000,000 سال تک جاری رہا۔ گرم اور مرطوب آب و ہوا والے عِلاقوں میں دَل دَلیں ہوتی ہیں۔ اِن دلدلوں میں اور اُن کے آس پاس جو درخت ہوتے ہیں، وہ گر کر اِنہی دلدلوں میں دب جاتے ہیں اور زیادہ عرصہ دبے رہنے سے کوئلے کی شکل اِختیار کر لیتے ہیں۔ (س۔ل)

قول و فعل

رِضوان محمّد خاں ثاقب

آں آں آں آں' ایمبولینس کے سائرن کی آواز مُسلسل آ رہی تھی۔ کھڑکیوں کے شیشوں کے نِصف حِصّوں پر پینٹ ہونے کی وجہ سے ایمبولینس میں پڑا مریض تو نظر نہیں آ رہا تھا، تاہم گاڑی میں لگے ہوئے ابتدائی طِبّی اِمداد کے آلات اور ایک خاتون کو بیٹھے ہوئے آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا۔ چوراہے سے جلوس گزر رہا تھا جس کی وجہ سے ساری ٹریفک رُکی ہوئی تھی۔ ایمبولینس میں بیٹھی ہوئی خاتون اِلتجا بھری نگاہوں سے جلوس کو دیکھ رہی تھی۔ محسوس ایسا ہو رہا تھا کہ جیسے وہ جلوس سے مریض کی زندگی کی بھیک مانگ رہی ہے۔

آج اِسکول جاتے وقت میرے کندھے پر بیگ کی بجائے ہاتھ میں ایک خوب صورت کتبہ (پلے کارڈ) تھا جو میں نے شہر کے مشہور پینٹر صوفی شریف سے لکھوایا تھا۔ یہ کتبہ اُس پروگرام کے لیے تھا جو اُس دن ہونا تھا۔ اُس میں ہمارا اِسکول بھی حصّہ لے رہا تھا۔ شہر بھر کے تمام اِسکولوں کے طَلَبہ اُس پروگرام کو کام یاب کرنے کے لیے پُورا مہینا لوگوں سے چندہ اِکٹھا کرتے رہے تھے۔ اساتذہ نے بھی بڑی بڑی کمپنیوں اور اداروں سے تعاوُن حاصِل کیا تھا۔

دوسرے بچّے بھی کتبے لے کر اِسکول آئے تھے۔ اِن کتبوں پر معذور بچّوں کے حوالے سے مُختلف فِقرے لکھے ہوئے تھے:

"عقل کے اندھے حاکمو! آنکھوں کے اندھوں کو بھکاری نہ بناؤ۔ یُونی سیف کی گرانٹ وزیروں کے لیے ہے یا معذوروں کے لیے؟ ہم تمام اندھے اکھیاروں کے لیے سفید چھڑی ہیں"۔ یہ اور اِس طرح کی دوسری مُختلف عِبارتیں اِن کتبوں پر لکھی ہوئی تھیں۔ میں نے جو کتبہ اُٹھایا ہُوا تھا اُس پر میرے والِد نے پینٹر شریف کی پسند کی عبارت لکھوائی تھی۔ جو کچھ یُوں تھی:

"ہم ہیں نابیناؤں کی آنکھیں   معذوروں کی
ہیں ہم ٹانگیں"۔

اسمبلی میں دُعا اور ترانے کے بعد ہیڈ ماسٹر صاحِب مائیک کے سامنے آئے اور کہنے لگے "بچّو' آپ کو معلوم ہے کہ آج شہر کے تمام اِسکولوں کے بچّے معذور بچّوں سے اِظہارِ ہمدردی کے لیے "واک فار اِسپیشل چلڈرن" کے نام سے ایک پروگرام کر رہے ہیں۔ ہم جلوس کی صورت میں آزادی چوک پہنچیں گے اور وہاں سے یُونی سیف کے دفتر تک واک ہوگی"۔ ہیڈ ماسٹر صاحِب نے مزید کہا کہ چلنے سے

پہلے میں سب بچّوں کے اِس جذبے اور محنت کی تعریف ضرور کروں گا جو اُنھوں نے اِس پروگرام کے لیے چندہ اِکٹھا کرنے کی صورت میں کی۔ اِس سے نہ صرف پروگرام کے اِخراجات پُورے ہو سکے بلکہ زائد رقم سے ہم نے دس ہزار کی تعداد میں ایک پمفلٹ بھی چھپوا لیا ہے جو ہم واک کے دوران میں لوگوں میں تقسیم کریں گے۔

واک شروع ہو چکی تھی۔ شہر بھر کے اِسکولوں سے آئے ہوئے طلَبہ کا بہُت بڑا جلوس مُختلف بینر اور کتبے اُٹھائے مین روڈ سے گزر رہا تھا۔ میں بھی اِس جلوس میں شامل تھا۔ میں ہولے ہولے چل رہا تھا، کیوں کہ آج سے پانچ سال پہلے مجھے ٹائی فائڈ بُخار ہُوا تھا جس سے میری ٹانگیں کم زور ہو گئی تھیں۔ اِس لیے ذرا تیز چلنے سے گر پڑتا تھا۔

جیسے جیسے جلوس آگے بڑھ رہا تھا، رُکی ہوئی ٹریفک بھی تھوڑا تھوڑا آگے سِرک رہی تھی۔ البتہ میرے اور جلوس کے درمیان فاصِلہ آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ویگنوں، بسوں، کاروں اور موٹر سائیکلوں پر سوار مسافر جلوس کے گزرنے کا بے تابی سے اِنتظار کر رہے تھے۔

جلوس آگے جا چکا تھا۔ میں نے پیچھے نظر دوڑائی تو دُور دُور تک گاڑیاں ہی گاڑیاں نظر آئیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ جلوس ٹریفک بند کر کے لوگوں کو اُس اہم مسئلے کی طرف توجّہ دلانے میں کام یاب ہو گیا ہے جس کے لیے یہ نکالا گیا ہے۔ میں پروگرام کی کام یابی پر خوش ہو رہا تھا کہ مجھے اچانک اُس ایمبولینس نے اپنی طرف مُتوجّہ کر لیا جو گاڑیوں کے درمیان کھڑی آں آں آں کر رہی تھی۔ اُس کے چاروں طرف اِس طرح گاڑیاں لگی ہُوئی تھیں جیسے سب آپس میں جُڑی ہُوئی ہوں۔ ایمبولینس میں لیٹے ہوئے مریض کی حالت شاید نازُک تھی کیوں کہ سائرن مُسلسل بج رہا تھا۔

مریض کے پاس بیٹھی ہوئی پریشان حال خاتون نے روتے ہوئے ڈرائیور سے کچھ کہا تو اُس نے ایمبولینس میں لگے ہوئے اِسپیکر کے ذریعے راستہ دینے کی درخواست کی۔ لیکن راستہ کیسے دیا جا سکتا تھا۔ آگے جلوس تھا اور پیچھے گاڑیاں ہی گاڑیاں۔

میرے چلتے ہوئے قدم تھوڑی دیر کے لیے رُکے۔ لیکن یہ سوچ کر کہ میں تو پہلے ہی بہُت آہستہ چلتا ہُوں اور اگر یہاں رُکا رہا تو جلوس سے بہُت پیچھے رہ جاؤں گا، آگے بڑھ گیا۔ اب جلوس اپنی مُقرّرہ جگہ پر پہنچ چکا تھا۔ یُونی سیف کے دفتر کے سامنے سیاسی جماعتوں کے لیڈر اور دوسرے لوگ تقریریں کر رہے تھے۔ اِن لوگوں نے اپنی تقریروں میں یُونیسف کے کارندوں کو معذوروں کے لیے اِکٹھی کی گئی اِمداد پر عیش کرنے والے طُفیلیے کہا اور عالمی اِدارۂ اطفال کو معذور بچّوں کی فلاح و بہبُود اور بحالی کی طرف توجّہ دلائی۔ اگلی صبح جب اخبارات نے ہمارے جلوس کی بڑی بڑی تصاویر اور خبریں شائع کیں اور جلوس میں شریک اِسکولوں کے نام شائع کیے تو میں اپنے اِسکول کا نام پڑھ کر بہُت خوش ہُوا۔

اِس واقعے کو گزرے تقریباً تین سال ہو گئے تھے۔ میں اب نویں کلاس کا طالبِ علم تھا۔ لیکن مجھے وہ دن اور وہ جلوس یاد تھا۔ آج جب میں آدھی چھٹّی کے وقت کچھ کھانے پینے کے لیے باہر نکلا تو اِسکول کے گیٹ کے سامنے ایک ریڑھی (ٹھیلا) دیکھی۔ یہ فروٹ چاٹ کی ریڑھی تھی۔ ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا جو دونوں ٹانگوں سے معذور تھا، اُس نے اپنی بیساکھیاں ریڑھی پر رکھی ہوئی تھیں اور گاہکوں کو چاٹ بنا بنا کر دے رہا تھا۔ ایک عورت جس نے ایک بڑی سی سفید چادر سے اپنے پُورے جسم کو ڈھانپا ہُوا تھا، ریڑھی میں رکھے ہوئے برتنوں میں پھل کاٹ کاٹ کر ڈال رہی تھی۔

آدھی چھٹّی کے بعد میں کلاس میں بیٹھا اُس عورت اور اُس کے معذور لڑکے کے بارے میں سوچتا رہا اور چھٹّی کی گھنٹی بجی تو اِسکول سے نکل کر سیدھا اُس کے پاس آ گیا۔ ریڑھی پر بچّوں کا رش اب بھی تھا، لیکن آدھ گھنٹے بعد جب ساری چاٹ بِک گئی اور عورت اور لڑکا اپنا سامان

سمیٹ کر چلنے لگے تو میں بھی اُن کے ساتھ ہولیا۔

عورت ریڑھی کو دھکیل رہی تھی اور لڑکا بیساکھیوں کے سہارے چل رہا تھا۔ میں نے اپنا بیگ ریڑھی پر رکھا اور عورت سے کہا "خالہ جی، لائیے میں اِسے دھکیلتا ہوں"۔

"لیکن بیٹا تم تو خود......" عورت کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

"جی ہاں، خالہ جی۔ میں ٹانگوں سے کچھ معذور ہوں لیکن میں نے کبھی معذوری کو مجبوری نہیں بننے دیا۔ ٹانگیں کمزور ہونے کے باوجود اللہ کے فضل سے سب کام کرتا ہوں" میں نے کہا "اچھا خیر، آپ یہ بتایئے کہ آپ کے بیٹے کی ٹانگوں کو کیا ہُوا؟"

"یہ تو اللہ ہی کو معلوم ہے۔ مجھے تو اُس نے اِسی حالت میں عطا کیا ہے" خالہ نے جواب دیا۔

"آپ دونوں ریڑھی کیوں لگاتے ہیں؟" میں نے پُوچھا "اِسے آپ اِدارۂ بحالیِ معذوراں میں داخل کروا دیں۔ وہاں پڑھ لِکھ کر کسی اچھی جگہ نوکر ہو جائے گا" میں نے کہا۔

خالہ نے ایک سرد آہ بھری اور کہنے لگیں "اِس کے باپ کی خواہش بھی اِسے پڑھانے کی تھی۔ وہ شہر کے مشہور پینٹر تھے۔ اُن کا نام شریف تھا۔ یہ صبح سے دوپہر تک اِسکول میں پڑھتا اور پھر اپنے ابُّو کے کام میں اُن کا ہاتھ بٹاتا۔ ایک دفعہ اشرف صاحب کا بڑا بیٹا معذور بچّوں کے لیئے چندہ لینے آیا تو اِس کے ابُّو نے میری چُوڑیاں اُتار کر اُس کے ہاتھ پر رکھ دیں۔ میں نے کہا، یہ تو گھر گھر سے چندہ اِکٹھا کر رہا ہے۔ اِسے تو کچھ نہ کچھ رقم مل ہی جائے گی۔ پھر آپ کو حاتم طائی بننے کی کیا ضرورت ہے؟"

وہ بولے "یہ خواہ لاکھ روپے اِکٹھے کرلے، مجھے تو اُتنے کا اجر ہی ملے گا جِتنا میں نے دیا ہوگا"۔

یہ واقعہ سُناتے ہُوئے خالہ کی آنکھوں میں آنسُو بھر آئے۔ اُنہوں نے اپنے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ایک صبح وہ میرے چندا کو اِسکول چھوڑ کر اپنی دُکان پر جا رہے تھے کہ اُن کی موٹر سائیکل ایک کُھلے مین ہول میں گر

گئی۔ اُنھیں شدید چوٹیں آئی تھیں۔ میں اُنھیں ایمبولینس میں ڈال کر ہسپتال کی طرف روانہ ہوگئی۔ لیکن بدقسمتی سے چوک میں سے اِسکول کے بچّوں کا بہُت بڑا جلوس گزر رہا تھا جس کی وجہ سے ٹریفک جام ہوگئی تھی۔ اِس کے ابّو ایمبولینس میں کئی گھنٹے زندگی اور موت کی کش مکش میں مُبتلا رہے۔ لیکن ایمبولینس کو راستہ نہ مِل سکا اور وہ اپنے مالکِ حقیقی سے جاملے"۔ خالہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

میں خالہ کی درد بھری کہانی سُن کر چونک اُٹھا۔ وہ میں ہی تو تھا جس نے سونے کی چوڑیاں شریف صاحِب سے لے کر ہیڈ ماسٹر صاحِب کو دی تھیں۔ پھر میری نظروں کے سامنے وہ ایمبولینس بھی گھوم رہی تھی جو مین روڈ پر کھڑی سائرن بجا رہی تھی۔ لیکن جلوس کی وجہ سے اُسے راستہ نہیں مِل رہا تھا۔ ایمبولینس سے کیے جانے والا یہ اعلان کہ براہ کرم رستہ دِیجیے، مریض کی حالت نازُک ہے، میرا ذہن بار بار دُہرا رہا تھا۔ پھر بھی میں نے پتا نہیں کیا سوچ کر یہ سوال کردیا "خالہ جی، کیا گاڑی خراب ہوگئی تھی؟"

"نہیں، بیٹا۔ میرے چندا جیسے مُلک کے دوسرے چنداؤں کو در در کے چندوں اور گھر گھر سے بھیک مانگنے سے بچانے کے لیے اسکول کے بچّوں نے جلوس نکالا تھا جس سے ٹریفک جام ہوگئی تھی"۔

میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ ہم معذور بچّوں کے حق میں آواز بلند کرنے کے لیے واک کرتے ہیں، جلسے کرتے ہیں، جلوس نکالتے ہیں اور مارچ کرتے ہیں اور اِدارے چلانے کے لیے چندہ اِکٹھا کرتے ہیں۔ لیکن اپنی ہی لاپرواہیوں سے اِن معذور نونہالوں کو بھیک مانگنے پر مجبور کردیتے ہیں۔

میں وہاں کھڑا اپنی سوچوں میں مگن تھا کہ وہ دونوں ریڑھی لے کر اپنے گھر میں داخل ہوگئے۔ میرا ضمیر مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اسے بُلا کر بتاؤ کہ تجھے بیوہ کرنے والے اور تیرے بیٹے کا سہارا چھیننے والے ہم لوگ ہی تھے۔

لیکن یہ سب کچھ بتانے کا کیا فائدہ؟ معذوروں کے ساتھ اِظہارِ ہمدردی کا یہ انداز تو اب بھی جاری ہے۔ اِدارے، کمیشن، کمیٹیاں، جلسے، جلوس، اِشتہار بازی اور ٹریفک بلاک تو اب بھی اِنہی معذوروں کے نام پر کی جارہی ہے۔ اِن کے لیے کوئی عملی قدم اُٹھانے کے لیے ہم ابھی تک کوئی خاص کام نہیں کرسکے۔

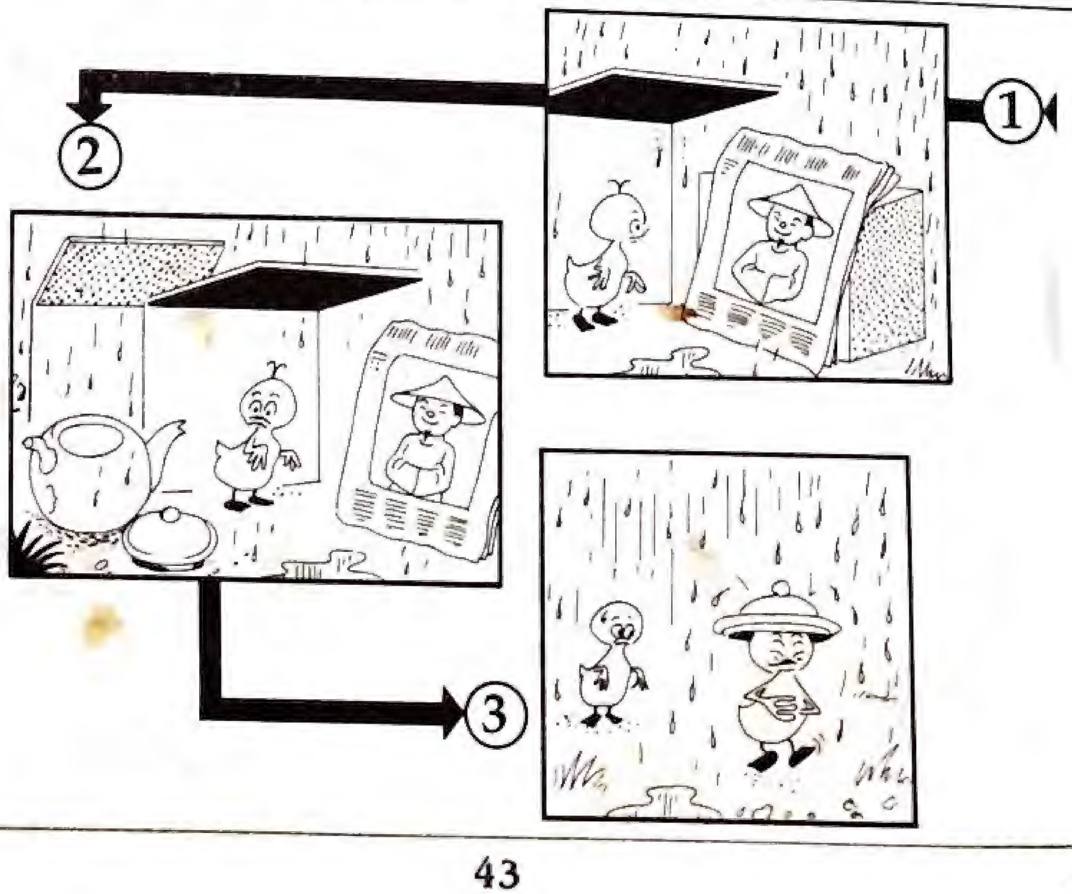

پاسا پرٹ

میرے ماموں جان پچھلے دِنوں جرمنی سے آئے تو میں نے اُن سے کہا کہ آپ کوئی مزے دار واقعہ سُنائیں۔ اُنھوں نے کچھ سوچنے کے بعد بتایا کہ ایک دفعہ وہ اور اُن کے چند ساتھی ٹرین میں چیکو سلواکیہ سے جرمنی جا رہے تھے۔ رات کا وقت تھا اور ہم سونے کی کوشش کر رہے تھے کہ ٹکٹ اور پاس پورٹ چیک کرنے والا آگیا۔ اُس نے میرے قریب آکر کہا "پاسا پرٹ"۔

میں سمجھا کہ یہ مجھے کروٹ بدلنے کو کہہ رہا ہے (پنجابی میں کروٹ لینے کو پاسا پرٹ کہتے ہیں)۔ لہٰذا میں نے کروٹ بدل لی۔ اُس نے دوبارہ کہا "پاسا پرٹ"۔ میں نے دوبارہ کروٹ بدل لی۔ اُس نے پھر یہی کہا اور میں نے ایک بار پھر کروٹ بدل لی۔ اِس پر اُسے غصّہ آگیا۔ یہ دیکھ کر میرے ایک ساتھی نے کہا کہ یہ پاس پورٹ مانگ رہے ہیں۔ اِن کی زبان میں پاسپورٹ کو پاسا پرٹ کہتے ہیں۔ ہمارا یہ سُن کر مارے ہنسی کے بُرا حال ہوگیا۔

(شمائلہ طاہر، گوجرانوالہ۔ اِنعام: 25 روپے کی کتابیں)

آپ کو کتنا سونا چاہیے؟

میں کمرے میں بیٹھا فروری 94ء کا تعلیم و تربیت پڑھ رہا تھا۔ ابھی میں نے صفحہ 6 کا مضمون "آپ کو کتنا سونا چاہیے؟" ختم ہی کیا تھا کہ میرے چھوٹے بہن بھائی کمرے میں داخل ہوئے۔ میں نے اُن سے کہا کہ بھئی، آپ سے ایک بات پُوچھوں؟

اُنھوں نے کہا "جی، پُوچھیں"۔

میں نے پُوچھا "آپ کو کتنا سونا چاہیے"؟

دونوں نے ایک ساتھ جواب دیا "بھائی جان، آپ کے پاس جتنا بھی سونا ہے، دے دیجیے"۔

یہ سُن کر میرا ہنس ہنس کر بُرا حال ہوگیا۔ دراصل مضمون کا عُنوان پہلی نظر میں دیکھنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں سونا حاصِل کرنے کا طریقہ بتایا جا رہا ہے۔

(شبّیر حُسین سنی، ملتان)

سیمی

یہ واقعہ میری خالہ کے ساتھ پیش آیا۔ وہ امریکا میں رہتی ہیں۔ اُن کی ایک بیٹی ہے جس کا نام سیما ہے مگر پیار سے سب اُسے سیمی کہتے ہیں۔

ایک دِن خالہ نیویارک کے شاپنگ سینٹر گئیں۔ سیمی اُن کے ساتھ تھی۔ وہ ایک دُکان پر رُکیں، کچھ چیزیں دیکھیں اور پھر آگے بڑھ گئیں، مگر سیمی وہیں رہ گئی۔

کچھ دیر بعد جب اُن کو سیمی کا خیال آیا تو اُنھوں نے

اُسے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ "سیمی! سیمی!" یہ سُن کر لوگ اُن کو گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ وہ سمجھے خالہ کہہ رہی ہیں "See me" یعنی مجھے دیکھو۔ سیمی تو مِل گئی لیکن خالہ کو بڑی شرمندگی ہُوئی۔

جب یہ واقعہ اُنھوں نے ہمیں سُنایا تو ہمارا ہنس ہنس کر بُرا حال ہوگیا۔ (سمیع احمد، ناگن چورنگی نارتھ کراچی)

جُملے بنانا

میرا چھوٹا بھائی تیسری جماعت میں پڑھتا ہے۔ ایک دفعہ امّی اُس کو اِمتحان کی تیّاری کروا رہی تھیں۔ اُنھوں نے اُسے دو لفظ "کمر بستہ اور گُن گانا" دِیے اور کہا کہ اِن کے جُملے بناؤ۔ اُس نے جُملے کچھ یُوں بنائے:

کمر بستہ: میں ہمیشہ اپنا کمر بستہ اپنے پاس رکھتا ہُوں۔

گُن گانا: ہمیں اِمتحانوں کے دِنوں میں گُن گانے نہیں چاہئیں۔ بلکہ پڑھنا چاہیئے۔

امّی نے یہ جُملے ہمیں دِکھائے تو ہمارا ہنس ہنس کر بُرا حال ہوگیا۔ (جویریہ رشید، سرفراز کالونی، فیصل آباد)

اَمپائر بھی اپنا ہوتا

پچھلے دنوں کی بات ہے، میرا ایک دوست ذیشان کلاس میں افسُردہ بیٹھا تھا۔ ہماری ٹیچر اندر داخل ہوئیں تو اُنھوں نے پُوچھا "ذیشان بُرا سا مُنہ بنائے کیوں بیٹھا ہے؟"

ایک لڑکے نے کھڑے ہو کر بتایا "مِس، کل اِس کا ایک بھائی پیدا ہُوا ہے"۔

"بھئی ذیشان، مُبارک ہو۔ اب آپ کتنے بہن بھائی ہیں؟" مس نے پوچھا۔

ذیشان بولا "مس، ہم دس بھائی ہیں"۔

یہ سُن کر مس کی بے اِختیار ہنسی چھُوٹ گئی۔ وہ بولیں "اِس کا مطلب ہے کہ آپ کی تو پُوری کرکٹ ٹیم ہے"۔

وہ بولا "مس، ہم بارہ بھائی تھے۔ دو فوت ہوگئے۔ وہ زندہ ہوتے تو اَمپائر بھی ہمارا اپنا ہوتا"۔

یہ سُن کر ساری کلاس بے اِختیار ہنس پڑی۔

(عثمان عدیل، کینال کالونی جہلم چھاؤنی)

آئس کریم

ایک دفعہ ہمارے ابّو آئس کریم لائے۔ اُنھوں نے آئس کریم فریزر میں رکھ دی اور کہا کہ تھوڑی دیر بعد کھائیں گے۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ چند مہمان آگئے۔ ابّو مہمانوں کو ڈرائنگ رُوم میں بٹھا کر کسی کام سے باہر آئے تو میری چھوٹی بہن نے پُوچھا کہ آئس کریم کب کھانی ہے۔ ابّو نے کہا کہ جب مہمان چلے جائیں گے تب کھائیں گے۔

جب کافی دیر ہوگئی اور مہمان نہیں گئے تو میری چھوٹی بہن مہمانوں کے پاس گئی اور بولی "آپ اپنے گھر کب جائیں گے؟ ہمیں آئس کریم کھانی ہے"۔

یہ سُن کر ابّو نے تو شرم سے سر جُھکا لیا اور مہمان ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوگئے۔

(عائشہ احمد، آمنہ انور، فیصل ٹاؤن لاہور)

تم کیا بنو گے؟

میں چھوٹے بھائی سُلیمان کو ہوم ورک کرا رہا تھا۔ ہمارے ساتھ ہمارے ماموں کا چھوٹا بیٹا سعاد بھی بیٹھا تھا۔ میں نے سُلیمان سے پوچھا کہ تم بڑے ہو کر کیا بنو گے تو اُس نے جواب دیا "فوجی"۔

اِس کے بعد میں نے ماموں کے بیٹے سے پُوچھا "سعاد تم بڑے ہو کر کیا بنو گے؟" تو وہ بولا "موچی"۔

یہ سُن کر ماموں نے تو سر جُھکا لیا لیکن ہمارا ہنس ہنس کر بُرا حال ہوگیا۔ (عزیز الطاف، جلال پور جٹاں)

مئی میں
تعلیم و تربیت کا سالنامہ شائع ہو گا۔

Sharjeel Ahmed

ایک نجومی نے کہا

عالم شفیع ہمدم، جھنگ

امجد غریب والدین کے بڑھاپے کا واحد سہارا تھا۔ اُس کے ماں باپ کی تمام خوشیاں اُسی کے دم سے تھیں۔ وہ ذہین بھی تھا اور محنتی بھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ زندگی کے ہر میدان میں کام یاب ہوتا۔ اُس کا باپ ایک کسان تھا اور اُس کی ماں گھر پر لوگوں کے کپڑے سیتی تھی۔ جب کہیں جاکر تینوں کا گزارہ ہوتا تھا۔

جب امجد کی عُمر پانچ سال ہوئی تو اُس کے باپ نے اُسے گاؤں کے پرائمری اِسکول میں داخل کروا دیا۔ وہ پڑھائی میں بہت اچھا تھا اور ہر جماعت میں پہلی پوزیشن حاصل کرتا تھا۔ اُس کے استاد اُس کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے اُس پر خاص توجّہ دیتے تھے۔ یہ اساتذہ کی مہربانیوں اور اُس کی محنت کا ہی ثمر تھا کہ اُس نے پانچویں کے وظیفے کے اِمتحان میں بورڈ میں ٹاپ کیا۔

امجد کی خواہش تھی کہ وہ آگے پڑھے، مگر اُس کے گاؤں میں کوئی مِڈل اِسکول نہ تھا۔ اُس کے باپ نے اُس کے شوق کو دیکھتے ہوئے اُسے دوسرے گاؤں کے مِڈل اِسکول میں داخِلہ دِلوا دیا۔ یہ گاؤں اُن کے گاؤں سے 3 میل کے فاصلے پر تھا۔ وہ ڈاکٹر بننا چاہتا تھا، اِس لیے اُس نے دن رات محنت کی اور نویں تک ہر جماعت میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اُسے مُباحثوں سے بھی دل چسپی تھی اور وہ ہمیشہ تقریری مقابلے میں اوّل یا دوم اِنعام حاصل کرتا تھا۔

جب امجد دسویں جماعت میں پہنچا تو اُس کی جماعت میں ایک نیا لڑکا داخِل ہُوا، جس کا نام عُمیر تھا۔ اُس کا تعلق امیر گھرانے سے تھا اور وہ بھی پڑھائی میں بہت اچھا تھا۔ آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ ہماری عام کہانیوں کی طرح امجد سے حسد کرنے لگے گا اور اُسے اساتذہ کی نظروں سے گرانے کے منصوبے بنائے گا۔ اُس کی سوچ پاکیزہ تھی اور اُس نے عام کہانیوں کے اُلٹ امجد کو اپنا دوست بنالیا۔

امجد اور عُمیر کی سوچ اور خیالات ایک جیسے تھے۔ اِس لیے وہ بہت جلد گہرے دوست بن گئے۔ دونوں ایک دوسرے کی پڑھائی میں بھی مدد کرتے تھے۔ اُنھوں نے امیری اور غریبی کے فرق کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اُن کے نزدیک اِنسان کا کِردار ہی سب کچھ تھا۔ اگر اِنسان کا کِردار اچھا نہیں تو وہ حیوانوں سے بد تر ہے۔

امجد اور عُمیر نے دسویں کے بورڈ کے اِمتحان میں پہلی اور دوسری پوزیشن حاصل کی۔ اگلے دن اُن کی تصویریں اخباروں میں چھپیں۔ دونوں دوست بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ اُنھوں نے شہر کے ایک کالج میں داخِلہ لے لیا۔ جس شہر میں وہ پڑھ رہے تھے، وہاں ایک نجومی کا بڑا چرچا تھا۔ امجد ایسے نجومیوں پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ عُمیر نے بڑی مُشکل سے اُسے راضی کیا کہ وہ اُس نجومی کے پاس جاکر اپنی قسمت کا حال معلوم کریں۔ اِس کے لیے اُنھوں نے جُمعے کا دِن مُقرّر کیا۔

جُمعے کے دن وہ اپنے پروگرام کے مُطابق نجومی کے پاس گئے۔ اُنھوں نے نجومی سے کہا کہ وہ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ مُستقبِل میں کیا بنیں گے۔ نجومی نے اُن کے اور اُن کے والِدین کے نام پُوچھے اور پھر کافی دیر تک کاغذ پر کچھ لکھتا رہا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد اُس نے اُن کے زائچے بنا کر اپنا سر اُوپر اُٹھایا اور بولا "عُمیر، تُمھارا مُستقبِل بہت روشن ہے۔ تمھاری مُراد پوری ہوگی اور تم ڈاکٹر بنو گے۔ مگر مُجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ امجد کا مُستقبل زیادہ روشن دکھائی نہیں دیتا۔ اِس کی مُراد کا پُورا ہونا بہت

مشکل ہے"۔ یہ سُن کر امجد پریشان ہوگیا جب کہ عُمیر بہُت خوش اور مُطمئن نظر آ رہا تھا۔

امجد نے اُس وقت سے ہی عہد کرلیا تھا کہ وہ پُوری محنت کرے گا اور بعد میں جو ہوگا' دیکھا جائے گا۔ اِس کے لیے اُس نے باقاعدہ ٹائم ٹیبل بنایا۔ وہ اُس پر سختی سے عمل کرتا اور زیادہ سے زیادہ وقت پڑھائی کو دیتا۔ اِس طرح اُس نے ایف ایس سی میں پورے بورڈ میں دوسری پوزیشن حاصل کی اور اُس کو میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا۔ اِس کے برعکس عُمیر نے پڑھائی پر توجّہ دینا چھوڑ دیا تھا اور جب امجد اُس کو پڑھنے کے لیے کہتا تو وہ یہ کہ کر ٹال دیتا کہ خدا نے میری قسمت میں ڈاکٹر بننا لکھ دیا ہے۔ مجھے محنت کرنے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں اپنی فکر کرنی چاہیئے۔ چُناں چہ اُس نے ایف ایس سی میں ڈی گریڈ حاصل کیا۔

عُمیر چوُں کہ امیر گھرانے کا چشم و چراغ تھا اِس لیے اُس نے پڑھائی چھوڑ دی اور کاروبار میں اپنے والِد کا ہاتھ بٹانے لگا۔ پھر کچھ عرصے بعد وہ اپنے والِدین کے ساتھ امریکا چلا گیا۔ اِس کے بعد امجد کو اُس کی کوئی خبر نہ ملی۔

دن گزرتے گئے۔ امجد نے ایم بی بی ایس کرلیا۔ لیکن اُس نے اپنی تعلیم یہیں ختم نہ کی۔ چوُں کہ اُس نے ایم بی بی ایس میں بہُت اچھے نمبر لیے تھے اِس لیے حکوُمت نے اُسے اعلیٰ تعلیم حاصِل کرنے کے لیے باہر بھیج دیا۔ چار سال بعد وہ تعلیم مُکمل کر کے وطن واپس آیا تو وہ آنکھوں کی بیماریوں کا اِسپیشلسٹ بن چکا تھا۔ اُس نے کچھ عرصہ سرکاری ہسپتال میں کام کیا اور پھر شہر میں اپنا ہسپتال کھول لیا۔

ایک دن ایک شخص اُس کے ہسپتال میں آیا۔ اُس نے کمپونڈر کو بتایا کہ میں ڈاکٹر امجد کا دوست ہوں اور اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔ کمپونڈر نے کہا کہ ڈاکٹر صاحِب آپریشن کر رہے ہیں۔ آپ اِنتظار کریں۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ڈاکٹر امجد آپریشن سے فارِغ ہُوا تو اُس نے عُمیر سے پُوچھا "فرمایئے' میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" عُمیر نے کہا "آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟ میں آپ کا دوست عُمیر ہوں" ڈاکٹر امجد نے اُسے غور سے دیکھا تو اُس کے ذہن کی اِسکرین پر بچپن کے واقِعات فِلم کی طرح گھومنے لگے اور پھر اُس نے ایک دم عُمیر کو گلے لگالیا۔

"سُناؤ' تم آج کل کیا کر رہے ہو؟" اُس نے عُمیر سے پُوچھا۔

میں تو ایک معمولی سا کلرک ہُوں" عُمیر نے جواب دیا۔

"مگر تُم تو امیر باپ کے بیٹے تھے اور تمہارا بہُت وسیع کاروبار تھا؟"

عُمیر نے آہ بھرتے ہوئے کہا "جب ہم امریکا گئے تو ہمارے کاروبار نے بہُت ترقّی کی۔ مگر یہ ترقّی دیرپا ثابت نہ ہوئی اور ہمیں بہُت جلد نُقصان اُٹھانا پڑا۔ بدقسمتی سے میرے والِدین کار کے حادثے میں ہلاک ہوگئے۔ اِس لیے مجھے پاکستان واپس آنا پڑا۔ اب میں پچھتاتا ہُوں کہ اگر میں تمہاری طرح محنت کرتا تو آج میں بھی ڈاکٹر ہوتا"۔

"دوست' اب پچھتانے سے کیا فائدہ۔ اُس روز ہم نجومی کے پاس نہ جاتے اور وہ اُلٹا سیدھا زائچہ بنا کر تمہیں خوش فہمی میں مُبتلا نہ کرتا تو تم بھی میری طرح دن رات محنت کرتے اور آج ڈاکٹر ہوتے۔

"بہرحال' جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ تم میرے بچپن کے دوست ہو اور میرے ہر دُکھ درد میں برابر کے شریک رہے ہو۔ میں بھلا تمہیں کیسے فراموش کر سکتا ہُوں۔ تم آج سے میرے ہسپتال میں کام کروگے"۔ یہ کہ کر اُس نے عُمیر کو سینے سے لگالیا۔

امجد نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ مقصد حاصِل کرنے کے لیے محنت بُنیادی چیز ہے' اور منزل خواہشوں سے نہیں' محنت کرنے سے مِلتی ہے۔ (پہلا اِنعام: 50 رُوپے کی کتابیں)

باپ اور بیٹا

منظر عبّاس خان، جھنگ صدر

آدھی رات کا وقت تھا۔ چاروں طرف ہُو کا عالم تھا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کبھی کبھار کسی جانور کے بولنے کی آواز آ جاتی، ورنہ سارا جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا۔

راشِد اِس ہُو کے عالم میں اپنی جیب کو مضبوطی سے پکڑے کسی پناہ کی تلاش میں تھا۔ اُسے اِس اندھیری رات میں اپنی کارروائی مکمّل کرنا تھی۔

جنگل کے ایک طرف ہرے بھرے کھیت تھے۔ وہ یہ سوچ کر اُس طرف چل پڑا کہ اُدھر آبادی ہوگی۔ اُس کا اندازہ غلط نہ تھا۔ اُسے کچھ فاصلے پر چند بوسیدہ مکان نظر آئے۔

وہ آگے بڑھا تو اُس نے دیکھا کہ ایک مکان میں دِیا جل رہا ہے۔ دروازے سے جھانک کر اُس نے اندر دیکھا تو ایک بوڑھا آدمی نظر آیا جو عبادت میں مصروف تھا۔

اُس نے دروازہ کھٹ کھٹایا۔ تھوڑی دیر بعد بوڑھا باہر آیا اور اُس کے پُوچھنے پر راشِد نے بتایا کہ وہ پردیسی ہے اور رات گزارنا چاہتا ہے۔ بوڑھا ایک نیک اور پارسا اِنسان تھا۔ پاکستان کے قیام کے وقت اُس کا بیٹا اُس سے بچھڑ گیا تھا۔ اور وہ بھری دُنیا میں اکیلا تھا۔

تیس سال بعد اپنے سامنے ایک نوجوان کو دیکھ کر اُسے اپنا بیٹا یاد آ گیا۔ وہ اُسے اندر لے گیا اور کمرے میں اُس کے لیے بستر بچھا دیا۔ راشِد جب دِیے کی روشنی کے سامنے آیا تو بوڑھا اُس کی ٹھوڑی کے نیچے ایک زخم کا نشان دیکھ کر چونک اُٹھا۔ اُس نے پُوچھ گچھ کی تو معلوم ہُوا کہ راشِد اُس کا اپنا بیٹا ہے۔ مُدّتوں کے بچھڑے ہُوئے باپ بیٹے ایک دوسرے سے مِل کر بہت خوش ہوئے۔ بوڑھا دِیا بُجھا کر باہر آ گیا اور سجدے میں گر کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے لگا، جس نے تیس سال بعد اُس کے بچھڑے ہُوئے بیٹے کو اُس سے مِلا دیا تھا۔ جب اُس نے سجدے سے سر اُٹھایا تو محسوس کیا کہ کمرے میں روشنی ہے۔ وہ کمرے کے دروازے کے نزدیک پہنچا اور اندر جھانک کر دیکھا۔ راشِد ٹارچ کی روشنی میں کوئی کاغذ دیکھ رہا تھا۔ ساتھ ہی ایک پستول اُس کے پاس پڑا تھا۔ بوڑھے کو شک ہُوا۔ مگر وہ خاموش رہا۔ سوچا، صبح پُوچھوں گا۔

صبح کو جب راشِد مُنہ ہاتھ دھو رہا تھا تو بوڑھے نے وہ کاغذ دیکھا جو کل رات راشد ٹارچ کی روشنی میں دیکھ رہا تھا۔ کاغذ پر اُس علاقے کا نقشہ بنا ہُوا تھا اور اُس میں ایک پُل پر دائرہ لگایا گیا تھا۔ بوڑھا سمجھ گیا کہ راشد دُشمن کا جاسُوس ہے اور جنگل کے نزدیک اُس پُل کو اُڑانے کے لیے پاکستان بھیجا گیا ہے۔ ایک طرف بیٹے کی محبّت اور دُوسری طرف وطن کی محبّت۔ وہ کافی دیر اِسی کش مکش میں مُبتلا رہا۔ لیکن پھر بیٹے کی محبّت پر وطن کی محبّت غالب آ گئی۔ اُس نے پستول اُٹھایا اور راشِد کا اِنتظار کرنے لگا۔

راشد ہاتھ مُنہ دھو کے کمرے میں آیا تو باپ کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر حیران رہ گیا۔

بوڑھے نے گرج دار آواز میں کہا "بیٹے کی محبّت وطن کی محبّت کے سامنے کوئی حیثیّت نہیں رکھتی۔ میرے ہوتے ہُوئے میرے وطن کی طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ چاہے وہ میرا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ میں یہی سمجھوں گا کہ میرا بچھڑا ہُوا بیٹا مجھے نہیں ملا"۔

اِس کے ساتھ ہی پستول کی نالی سے گولی نکلی اور راشد کے سینے میں اُتر گئی۔ وہ چیخ مار کر گرا مگر گرنے سے پہلے بوڑھے نے اُسے سنبھال لیا اور پھر آسمان کی طرف سر اُٹھا کر کہنے لگا "اے بُزرگ و برتر اللہ! میرے پاس وطن کو پیش کرنے کے لیے اِس سے بڑھ کر اور کوئی نذرانہ نہیں"۔

(دُوسرا انعام: 45 رُوپے کی کتابیں)

Shaz...

ایک دِن کی بادشاہت

محمّد رِضوان احمد، ناظِم آباد 2 کراچی

بعض اوقات اِنسان کی زندگی میں ایسے واقعات پیش آتے ہیں جن کا اثر زندگی بھر رہتا ہے۔ ایسا ہی ایک واقِعہ میرے ساتھ پیش آیا جو آپ کی نذر کر رہا ہوں۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میٹرک کا رِزلٹ آوٹ ہو رہا تھا اور تمام محلّے میں اُدھم برپا تھا کہ کون پاس ہوتا ہے اور کون فیل۔ ہم نے بھی میٹرک کا اِمتحان دے رکھا تھا اور بے صبری سے رِزلٹ کا اِنتظار کر رہے تھے۔ لیکن ہم سے زیادہ بے چین ہمارے گھر والے تھے، جن میں ہمارے ماموں پیش پیش تھے اور صرف ہمارا نتیجہ دیکھنے کے لِیے اِسلام آباد سے کراچی تشریف لائے تھے۔ بعض اوقات تو یُوں محسوس ہوتا کہ اِمتحان ہم نے نہیں دیا، ہمارے ماموں نے دیا ہے۔ وہ بار بار ہم سے پُوچھتے کہ پرچے تو اچھے ہوئے ہیں ناں؟ اُنھوں نے ہم سے کہا تھا کہ اگر تم اچھے نمبروں سے پاس ہوگئے تو تمھیں ایک خوب صورت سی گھڑی دیں گے۔

اور پھر وہ قیامت کی گھڑی آگئی جب رزلٹ آوٹ ہونے والا تھا۔ اُس دن ہم صبح پانچ بجے ہی اُٹھ بیٹھے۔ سوچا کہ جاکر اخبار لے آئیں۔ لیکن یہ کیا؟ ہم سے پہلے ماموں جان اُٹھ گئے تھے۔ اُنھوں نے ہم سے کہا "ذرا اپنا رول نمبر دینا۔ میں اخبار خریدنے جا رہا ہوں"۔ ہم نے جلدی سے اپنے ایک کلاس فیلو کا نمبر بتا دیا جِس کے بارے میں ہمیں سو فی صد یقین تھا کہ وہ اچھے نمبروں سے پاس ہُوا ہوگا۔

کوئی آدھے گھنٹے کے بعد ماموں جان ایک دھماکے کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے اور ہمیں گلے لگا کر بولے کہ ہمارا بیٹا فسٹ ڈویژن میں پاس ہُوا ہے۔ بس جناب، پھر کیا تھا۔ پورے گھر میں زلزلہ آگیا۔ ابّا جان نے ہماری پیٹھ ٹھونکی، امّی جان نے سینکڑوں بلائیں لیں، دادا جان نے اپنے پوپلے مُنہ سے خدا کا شکر ادا کیا اور چھوٹے بہن بھائی خوشی سے اُچھلنے کودنے لگے۔ اِدھر ہم نے پُورا اخبار چھان مارا مگر ہمارا نمبر نہ ملا۔

اور پھر شام کو تمام رشتے داروں اور دوستوں کی دعوت کا اِنتظام کیا گیا۔ لوگ تحفے لے لے کر آنے لگے۔ ہم دل میں سخت شرمندہ تھے۔ سوچ رہے تھے کہ یہ خوشی کتنی دیر کی ہے۔ جلد ہی بھانڈا پھُوٹ جائے گا۔

اِتنے میں ابّاجان کے ایک دوست حکیم صاحِب بھی اخبار ہاتھ میں لیے آگئے۔ پہلے تو اُنھوں نے ہمیں مُبارک باد دی اور پھر بولے کہ ہمارا بھانجا بھی پاس ہوگیا ہے۔

ماموں جان نے پوچھا "کون سے ڈویژن میں؟"

حکیم صاحِب نے جواب دیا "فسٹ ڈویژن میں۔ اُس نے 645 نمبر حاصل کیے ہیں"۔

یہ سُن کر ماموں جان چونکے۔ اُنھوں نے کہا "645 نمبر تو میرے بھانجے نے حاصل کیے ہیں"۔

یہ سُن کر حکیم صاحِب نے ہم سے رول نمبر پُوچھا۔ اب بھلا ہم کیا کہتے؟ جب دیکھا کہ چُھٹکارا مُشکِل ہے تو اپنا رول نمبر بتا دیا۔ اُنھوں نے اخبار دیکھا تو سخت حیران ہوئے۔ کہنے لگے "ارے صاحِب! یہ رول نمبر تو اِس میں کہیں بھی نہیں ہے"۔

اِس کے بعد کیا ہُوا؟ یہ نہ ہی پُوچھیں تو اچھا ہے۔ جب ہمیں ہوش آیا تو تمام تحفے غائب ہو چکے تھے اور سارے گھر والے ہمیں غصّے سے گھُور رہے تھے۔

(تیسرا اِنعام: 40 روپے کی کتابیں)

بھیانک سزا

اُبوبکر شوکت علی بھٹّی اوسلو (ناروے)

ہمارے بھائی جان اِنگلینڈ سے آئے ہُوئے تھے۔ ہم

نے اُن سے کہا کہ آپ ہمیں لاہور کی سیر کرا لائیں۔ پہلے تو اُنھوں نے اِنکار کیا، لیکن جب ہم نے بہت ضِد کی تو مان گئے۔ ہم دینہ سے جہلم گئے اور پھر جہلم سے لاہور جانے والی بس میں بیٹھ گئے۔

گوجرانوالہ میں بس رُکی تو ایک بوڑھی عورت بس میں سوار ہُوئی۔ اُس کے کپڑے پھٹے ہُوئے تھے اور وہ بے حد غریب لگتی تھی۔ اُس کے پاس ایک گٹھڑی تھی۔ جب کنڈکٹر نے اُس سے کرایہ طلب کیا تو اُس نے کہا کہ میرے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ میں بہت غریب ہوں۔ لاہور اپنی بیٹی کے پاس جا رہی ہوں۔

کنڈکٹر نے اُس کی ایک نہ سُنی، اُس کو خوب بُرا بھلا کہا، اُس کی گٹھڑی اُٹھا کر باہر پھینک دی اور اُسے نیچے اُترنے کو کہا۔ ہمیں بے چاری بُڑھیا پر ترس آگیا اور ہم نے اپنی جیب سے دس دس روپے کے دو نوٹ نکال کر کنڈکٹر کو دیے۔ اُس نے کرائے کی رقم کاٹ کر باقی رقم ہمیں دے دی۔ ہم نے وہ رقم بھی بُڑھیا کے حوالے کر دی۔

اِس واقعے کے تقریباً دو سال بعد ہمیں جہلم جانے کا اِتّفاق ہُوا۔ وہاں ہم نے ایک آدمی کو زمین پر ہاتھوں کے بَل گھسٹتے ہوئے دیکھا۔ اُس کی شکل جانی پہچانی سی لگی۔ ہم نے قریب جا کر اُس سے کہا کہ ہم نے تمھیں اِس سے پہلے کہیں دیکھا ہے۔ تم شاید کسی بس کے کنڈکٹر تھے۔

یہ سُن کر وہ شخص رونے لگا۔ اُس نے کہا "ہاں۔ میں بس کنڈکٹر ہی تھا۔ مگر بدقسمتی سے بس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا اور میری ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ اب مجھ سے کوئی کام نہیں ہوتا"۔

اُس کی یہ بات سُن کر ہماری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ہم نے اُس سے کہا کہ تمھیں اُس بڑھیا کی بد دُعا لگ گئی۔ وہ بہت رویا اور کہنے لگا "آپ سچ کہتے ہیں۔ مجھے اُسی گُناہ کی سزا ملی ہے"۔

(چوتھا اِنعام: 35 روپے کی کتابیں)

بچپن کی شرارت

فرزانہ حمید، پیپلز کالونی خانیوال

بچپن کے بارے میں سوچتی ہُوں تو ہونٹوں پر بے اِختیار مُسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔ بچپن کے دِن خوشیوں کے دن ہوتے ہیں۔ نہ کوئی فکر نہ کوئی دُکھ۔ ایسے میں نِت نئی شرارتیں کرنے کو دل چاہتا ہے۔

اِس وقت میں آپ کو بچپن کی ایک شرارت سُناتی ہُوں۔ میں اور میری کزن عاشی دادی امّاں کے کمرے میں سویا کرتے تھے۔ عاشی دادی امّاں کے ساتھ سوتی اور میں الگ چارپائی پر۔

ایک مرتبہ رات کو مجھے نیند نہیں آ رہی تھی کہ اچانک مجھے ایک شرارت سُوجھی۔ میں نے ایک دِیا سلائی لی اور دادی امّاں کے پاس لیٹی ہوئی عاشی کے کان میں پھیر دی۔ عاشی نے جلدی سے کان کھُجلایا اور بڑے زور سے ہنسی۔ دادی امّاں نے کَس کے ایک تھپّڑ مارا اور کہا "کیا کھِی کھِی کر رہی ہو؟ اب سونے بھی دو گی یا نہیں؟" عاشی بولی "فری کان میں تِنکا پھیر رہی ہے" دادی جان نے ڈانٹ کر کہا "سو جاؤ، چُپ کر کے۔ اب شرارت کی تو ماروں گی"۔

تھوڑی دیر بعد میں نے پھر دِیا سلائی اُس کے کان میں پھیر دی۔ لیکن وہ عاشی کا کان نہ تھا۔ یہ اُس وقت معلوم ہوا جب دادی جان ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھیں۔ اُنھوں نے لائٹ جلائی تو ہم نے دیکھا کہ اُن کی ایک اُنگلی اُن کے کان میں تھی۔ اب مجھے کیا معلوم تھا کہ اُنھوں نے عاشی سے جگہ بدل لی ہے۔ اب حالت یہ تھی کہ وہ ایک ہاتھ سے کان کھُجلا رہی ہیں اور دوسرے ہاتھ سے میرے اُوپر جُوتے برسا رہی ہیں۔ عاشی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوئے جا رہی تھی۔ آخر دادی جان بھی ہنس پڑیں اور اِس طرح ہماری جان چھُوٹی۔

(پانچواں اِنعام: 30 روپے کتابیں)

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore
PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES Price Rs. 10.0

FEROZSONS PRIMARY SCIENCE

FEROZSONS EDUCATIONAL

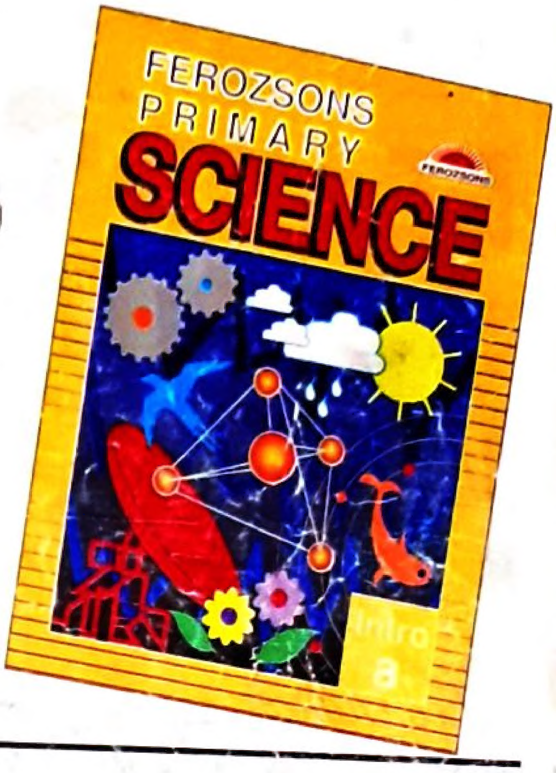

FEROZSONS PRIMARY SCIENCE is a complete series of twelve systematically graded books, well suited to the educational needs of children in English Medium Schools worldwide.
[The] aim of this series is to present the fundamentals of science in a [way] which children can easily understand and assimilate. They will no[t] only remember the facts but also remember that the learning of th[e]m was a joyful experience.
Each book is divided into a number of parts which cover the main areas of study and are colour-coded for easy reference.
All the books are richly illustrated in colour and each drawing has been specially chosen to complement and support the text. Each book commences with an interest-stimulating quiz and ends wi[th] an extra-curricular exercise entitled 'Do You Know?'

Intro a
Part 1 Human beings
Part 2 Healthcare and safety
Part 3 Living and non-living things
Part 4 Animals
Part 5 Objects
[...]0141 2 — R[s.] 35.00

1a
Part 1 Human beings
Part 2 Things around us
Part 3 Living and non-living things
Part 4 Animals
Part 5 Animals and their babies
969 0 [...] — Rs. [...]

2a
Part 1 Human beings
Part 2 Health and safety
Part 3 Animals
Part 4 More about animals
Part 5 Sound
Part 6 Magnetism
969 0 10094 7 — Rs. 40.00

Intro b
Part 1 Plants
Part 2 Food
Part 3 Light and Heat
Part 4 Movement
Part 5 Distance
Part 6 Earth and Sky
Part 7 Time
[9]69 0 0142 0 — Rs. [3]5.00

1b
Part 1 Objects
Part 2 Plants
Part 3 Force and machines
Part 4 Energy
Part 5 Sound
Part 6 Magnetism
Part 7 Heat and temperature
Part 8 Light and shadow
Part 9 Time
969 0 10093 9 — Rs. 40.00

2b
Part 1 Colours
Part 2 Plants
Part 3 Force and machines
Part 4 Energy
Part 5 Electricity
Part 6 Material and matter
Part 7 Time
969 0 10095 5 — Rs. 40.00

3a
Part 1 Human beings
Part 2 Healthcare and safety
Part 3 Animals
Part 4 Sound
Part 5 Magnetism
Part 6 More about animals
[9]69 0 10096 3 — Rs. 40.00

4a
Part 1 Human beings
Part 2 Healthcare and safety
Part 3 Living things and their needs
Part 4 Living things protect themselves
Part 5 Sound
Part 6 Magnetism
969 0 10098 X — Rs. 40.00

5a
Part 1 Human beings
Part 2 Healthcare and safety
Part 3 Animals
Part 4 Sound
969 0 10100 5 — Rs. 50.00

3b
Part 1 Light and colour
Part 2 Plants
Part 3 Heat energy
Part 4 Light energy
Part 5 Force and energy
Part 6 Materials and matter
Part 7 Earth and atmosphere
Part 8 Time
[9]69 0 10097 1 — Rs. 40.00

4b
Part 1 Colours
Part 2 Plants
Part 3 Heat and temperature
Part 4 Electricity
Part 5 Time
969 0 10099 8 — Rs. 40.00

5b
Part 1 Plants
Part 2 Animals
Part 3 Force and motion
Part 4 Heat and electricity
Part 5 Matter
Part 6 Earth and atmosphere
Part 7 Time
969 0 10101 3 — Rs. 50.00

(Prices are subject to change without notice)

[Als]o under publication: Available in 1994

[Fe]rozsons Primary English
[Fe]rozsons Primary Mathematics
[Fe]rozsons Primary Atlas.

FEROZSONS (Pvt) LTD.
LAHORE RAWALPINDI KARACHI
Lahore: 60, Shahrah-e-Quaid-e-Azam, Phones: 301196-98 Fax: 6278816
Rawalpindi: 277, Peshawar Road, Rawalpindi, Phone: 563503 Fax: 56427[3]
Karachi: 1st Floor, Mehran Heights, Main Clifton Road, Karachi,
Phones: 570527-570534-537730 Fax: 570534